اسلامی علوم وتحقیقات اورزبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

جلد: ۰۴، شمارہ: ۰۷ شوال/ ذیقعدہ ۱۴۴۳ھ، مئی/ جون ۲۰۲۲ء

النخیل کراچی

بانی

ابن الحسن عباسی رحمۃ اللہ علیہ

اسلامی علوم وتحقیقات اور زبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

النخیل

جلد: ۰۴، شمارہ: ۰۷، شوال المکرم/ ذیقعدہ ۱۴۴۳ھ، مئی/ جون ۲۰۲۲ء

ادارہ تراث الادب

alnakhil786@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فی شمارہ:.... 70روپے　　**سالانہ زرِتعاون** :.... 700 روپے

خط وکتابت کا پتہ:.....ادارہ تراث الادب، ۷۰/ دس آر، آریہ نگر، خانیوال

رابطہ نمبر:.......... 03004097744-03444023470

صدائے نخیل

کوئی نسبت تو ہوئی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مجھے!

مدیر کے قلم سے

بھارت کی حکمران بھارتیہ جنتا پارٹی کی مرکزی ترجمان نوپور شرما اور میڈیا کے شعبے کے کرتا دھرتا نوین جندال کی جانب سے ٹی وی پروگراموں اور ٹویٹر پر شان رسالت میں گستاخی کا ارتکاب اور بھارت کی مودی سرکار کی جانب سے اس کی در پردہ حمایت نے پوری اسلامی دنیا کو ایک بار پھر جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور مقام شکر ہے کہ اس بار سوشل میڈیا کی برکت سے عالم اسلام بالخصوص عرب دنیا نے توہین رسالت کے واقعے پر بروقت اور بھرپور ردعمل دیا اور بھارت کی ہندو انتہا پسند مودی سرکار کو دفاعی پوزیشن پر آنے پر مجبور کر دیا ہے۔تاہم اس واقعے نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو پھر سے یہ یاد دہانی بھی کرادی ہے کہ اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت و ناموس کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے امت مسلمہ کو ایک ہمہ جہت اور ہمہ گیر جدوجہد کے لیے تیار رہنا ہے۔

ویسے تو دنیا میں خیر وشر اور حق و باطل کی معرکہ آرائی ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور اللہ کی زمین کسی بھی دور میں ایسے لوگوں سے خالی نہیں رہی جو سچائی کی جنگ لڑتے، حق پر قائم رہتے اور باطل سے دودو ہاتھ کرتے ہیں، وہیں دوسری جانب ایسے لوگ بھی روئے زمین پر ہمیشہ وافر مقدار میں پائے جاتے رہے ہیں جو طاغوت پر ایمان رکھتے، کفر وشرک پر اڑتے اور حق والوں سے ستیزہ کاری کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔اقبال کا شعر ہے تو بہت مشہور لیکن اس کی معنویت کی گہرائی اسے ہردم تازہ و

تابندہ رکھتی ہے کہ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

آج کی دنیا کے منظر نامے پر اگر ایک نظر دوڑائی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی کی ستیزہ کاری اس وقت کی سب سے بڑی عالمی حقیقت ہے۔ گزشتہ صدی کے نصف آخر میں مغربی سرمایہ داریت اور روسی اشتراکیت کی کشمکش دنیا کی سب سے بڑی معرکہ آرائی قرار پائی اور دنیا کے خطیر وسائل اس جنگ میں جھونکے گئے جبکہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد رواں صدی کے آغاز سے پہلے ہی یہ بات طے کر لی گئی تھی کہ نئی صدی میں مغربی سرمایہ داریت کا ہدف اسلام کا ''خطرہ'' ہوگا۔ عالمی طاقتوں نے اس مقصد کے لیے جہاں عراق اور افغانستان سمیت دنیا کے مختلف حصوں میں بودے بہانوں سے گرم محاذ کھولے اور لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کیا، وہیں ساتھ میں نظریاتی جنگ کے لیے ابلاغی ہتھیاروں کو بھرپور طریقے سے بروکار لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسلام سے متعلق تشکیک پھیلانے اور مسلم معاشروں کو اسلامی تعلیمات سے برگشتہ کرنے کے لیے مختلف حربے بروئے کار لائے جانے لگے۔

ان میں سے سب سے خطرناک حربہ مسلمانوں کی محبتوں اور عقیدتوں کے مرکز و منبع محسن انسانیت حضور رسالت ماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات پر رکیک حملے کر کے امت مسلمہ کے قلب وجگر کو چھلنی کرنے کا حربہ تھا۔ مغرب جانتا ہے کہ حضور خاتم النبیینؐ سے محبت وعقیدت دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے درمیان بائینڈگ فورس ہے اور آپؐ کے ساتھ مسلمانوں کا رشتہ کمزور پڑ گیا تو اس کے لیے اپنے عزائم کی تکمیل آسان ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت مغربی اخبارات وجرائد میں توہین آمیز خاکے اور مضامین شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا اور جب مسلمانوں نے اس ناپاک جسارت کے خلاف احتجاج شروع کیا اور عالمی قوتوں سے اس دریدہ دہنی کو روکنے کا مطالبہ کیا تو مسلمانوں کے اس احتجاج کو ''انتہا پسندی'' جبکہ توہین رسالت کی ناپاک کوششوں

کو ''آزادئ اظہار'' کا حق باور کرانے کی کوشش کی گئی۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق چند مسلماں نوجوانوں نے خاکے شائع کرنے والے جرائد کے دفاتر پر حملے کیے تو باوجود اس کے اسلامی دنیا کے ذمہ دار ممالک اور شخصیات نے ان حملوں کی مذمت کی، اگلے ہی روز ۴۰ مغربی ممالک کے سربراہان ہنگامی بنیاد پر جمع ہو کر توہین رسالت کے مجرموں کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور یہ پیغام دے دیا کہ انہیں دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے مجروح جذبات و احساسات کی کوئی پروا نہیں ہے اور درحقیقت وہی چراغ مصطفوی کے مقابلے میں شرار بولہبی کو بھڑکانے والے ہیں۔

ان قوتوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پاکستان سمیت ان اسلامی ممالک پر جہاں توہین رسالت جرم ہے، دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ انسداد توہین رسالت کے قوانین کو ختم کر کے ناموس رسالت کے خلاف دریدہ دہنی کے لیے میدان ہموار کریں تاکہ وہ اپنے پیادوں کو اس میدان میں اتار سکیں۔ یہ کوششیں تو زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں تاہم دوسری جانب رواں عشرے کے آغاز پر سوشل میڈیا کی صورت میں مغرب کو ایک نیا ہتھیار میسر آ گیا، اس ہتھیار کو استعمال کرنا اس لیے آسان ٹھہرا کہ اس کے ذریعے چھپ کر وار کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک وقت ایسا آیا جب پاکستان جیسے ملک میں جہاں ۹۸ فی صد آبادی مسلمان ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ عقیدت بھی رکھتی ہے، سوشل میڈیا کے ذریعے انتہائی غلیظ اور نجس پروپیگنڈے کا آغاز کیا گیا۔

بھارت میں ہندو انتہا پسند پارٹی بھارتیہ جنتا پارٹی کی قیادت کی جانب سے شان رسالت میں ہرزہ سرائی بھی دراصل نفرت اور عداوت کی اس مہم کا ایک حصہ ہے جو نائن الیون کے بعد مسلمانوں کے خلاف شروع کی گئی ہے۔ اس مہم کو ناکام بنانے کے لیے جہاں پوری دنیا کے مسلم حکمرانوں کو ٹھوس اور موثر اقدامات کرنے کی ضرورت ہے، وہیں مسلم دانشوروں، ججوں، وکلاء، صحافیوں اور اہل قلم کا بھی فرض بنتا ہے کہ وہ آزادی اظہار کے نام پر دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی دل آزاری کے اس مذموم سلسلے کے سدباب کے لیے اپنی زبان اور قلم کی صلاحیتیں بروئے کار لائیں۔

اس سلسلے میں ایک روشن مثال اسلام آباد ہائی کورٹ کے سابق جناب جسٹس شوکت عزیز صدیقی کا

وہ تاریخی فیصلہ بھی ہے جس میں جسٹس صاحب نے اپنے دور میں سوشل میڈیا پر توہین رسالت کے مقدمے میں انتہائی جرأت مندانہ اور تاریخی فیصلہ جاری کر کے پوری پاکستانی قوم کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا۔ جناب جسٹس شوکت عزیز صدیقی نے اس مقدمے کی سماعت کے دوران جس طرح تمام متعلقہ سرکاری اداروں کے افسران کے ایمان وغیرت کو جھنجھوڑا اور سوشل میڈیا پر توہین رسالت کے سدباب کے لیے جو احکامات جاری کیے، اس سے پاکستان کے بیس کروڑ مسلمانوں کو ایک ڈھارس ملی کہ پاکستان کے ریاستی اداروں میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی بدولت ہم اپنے اداروں پر فخر اور اعتماد کر سکتے ہیں۔ جسٹس شوکت عزیز صدیقی کا یہ فیصلہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے اور راقم اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہے کہ جسٹس صاحب کے دستخط کے ساتھ سے یہ کتاب بندہ کے بھی نظر نواز ہوئی ہے۔ بندہ نے بہت سے پینٹ کوٹ والے حضرات کو علماء وبزرگان دین سے انتہائی عقیدت وانکساری سے ملتے اور ان کی دست بوسی کرتے دیکھا ہے، مگر کچھ عرصہ قبل ایک نجی تقریب میں بڑے بڑے علماء کو پینٹ کوٹ میں ملبوس جسٹس شوکت عزیز سے دینی عقیدت سے ملتے اور ان پر عقیدتوں کے پھول نچھاور کرتے دیکھا اور زبان پر بے اختیار یہ آیت آ گئی کہ ذالك فضل الله يوتيه من يشاء۔

جناب جسٹس شوکت عزیز صدیقی کا یہ فیصلہ ایک جانب ان کی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارکہ سے بے پناہ محبت وعقیدت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس کے ایک لفظ اور پیرے میں حب نبوی کے کوثر وتسنیم کی آب وتاب جھلکتی ہے تو دوسری جانب یہ بین الاقوامی اور ملکی قوانین پر ان کی زبردست دست رس کی بھی گواہی دیتا ہے۔ جسٹس صدیقی نے اپنے اس فیصلے میں جہاں قرآن وسنت کے دلائل وبراہین، اسلامی تاریخ اور فقہ کے نظائر اور نامور مسلم مفکرین وعلماء کی آراء سے انسداد توہین رسالت کے اسلامی احکام کو الم نشرح کر دیا ہے، وہیں ساتھ میں اقوام متحدہ کے چارٹر، بین الاقوامی قوانین، مغربی و یورپی ممالک کے عدالتی فیصلوں اور رائج دساتیر کے نظائر سے ان تمام اشکالات و شبہات کو مدلل اور مسکت جواب دیا ہے جو آزادئ اظہار اور تحفظ افکار کے نام پر پھیلائے جا رہے ہیں۔ جسٹس صاحب نے ناقابل تردید دلائل سے ثابت کیا ہے کہ دنیا کے کسی قانون اور ضابطے میں

''اظہار کی آزادی'' اور ''اظہار کی ذمہ داری'' کو الگ الگ نہیں کیا گیا۔ جسٹس صاحب کے اس فیصلے پر اگر مختصر تبصرہ کیا جائے تو یہ ناموس رسالت کے تحفظ کے سلسلے میں مسلمانوں کے علمی ورثے کا خلاصہ اور نچوڑ ہے اور اس کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ محض ایک تحقیق یا تصنیف نہیں بلکہ باقاعدہ ایک قانونی دستاویز ہے۔ گویا جسٹس صاحب نے اس مسئلے پر امت مسلمہ کے موقف پر عدالتی مہر ثابت کر دی ہے اور اپنے سچے اور کھرے ''صدیقی'' ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ جسٹس صاحب نے اس فیصلے میں ملک میں توہین رسالت کے سد باب کے لیے بہترین سفارشات پیش کی ہیں، توہین رسالت کے جھوٹے مقدمات قائم کرنے کی روک تھام کے لیے انہوں نے تجاویز دی ہیں جن پر غور کیا جانا چاہیے۔ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے فیصلے کی کتاب پر مختصر اور جامع تقریظ لکھی ہے جبکہ دیگر کئی علماء اور مذہبی رہنماؤں کی فیصلے سے متعلق تحریریں کتاب کا حصہ ہیں۔ کتاب میں شامل عرفان صدیقی کی تحریر اور ختم نبوت سے متعلق پارلیمنٹ میں ذوالفقار علی بھٹو کی تقریر بھی پڑھنے کی چیز ہے۔

جسٹس صاحب نے فیصلے کا آغاز قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کے حوالوں اور اختتام علامہ ابن تیمیہؒ کی شہرہ آفاق کتاب ''**الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول**'' کے اقتباس سے کیا ہے اور آخر میں اپنے جذبات کی ترجمانی ان اشعار سے کی ہے ؎

میں نہ زاہد، نہ مجاہد، نہ مفسر نہ حکیم
میری دولت دل شرمندۂ عصیاں ہی سہی
کوئی نسبت تو ہوئی رحمت عالمؐ سے مجھے
آخری صف کا میں ادنیٰ سا مسلماں ہی سہی

محمد شفیع چترالی
۰۷ ذیقعدہ ۱۴۴۳ھ

ماہ وسال

عقیدتوں کا سفر

مولانا ابن الحسن عباسیؒ

ماہ ذی قعدہ کے آخر اور ذی الحجہ کی آمد آمد پر سوئے حرم جانے والے تیز گام قافلے گردش میں آنے لگتے ہیں، ان ایام میں حجاز سے آنے والی سحر کی گل گشت ہواؤں کی خوشبو کچھ زیادہ ہی دل کے آنگن کو مہکار دیتی ہے، شاید اس لیے کہ راہِ عشق وجنون کے مسافروں کے بے تاب نالوں کی گونج بھی ان لہروں میں شامل ہوجاتی ہے، جب ”...... **لبیک اللھم لبیک**...... “کی والہانہ صداؤں سے حرم، منیٰ، عرفات مزدلفہ اور وادی بطحا کے بام ودر گونج اٹھتے ہیں۔

حرم:......رب ذوالجلال کی کبریائی کا مظہر، جہاں سکندری وقلندری کی مصنوعی روشیں فنا ہوکر شاہ وگدا، فقیر وامیر اور محمود وایاز ایک ہی صف اور یکساں لباس میں کھڑے، رب کے حضور گڑگڑاتے اور دنیوی آفتاب ذروں کا روپ دھارتے دکھائے دیتے ہیں...... جہاں ”بیت اللہ“ واقع ہے، ہستی کے صنم خانوں میں وہ پہلا گھر خدا کا، جس کا ایک ایک بقعہ، تجلی گاہ جلال و جمال اور جس کا نظارہ دل پر دیوانگی وارفتگی کا ایک عالم بے خودطاری کردیتا ہے، جہاں نفس کے داغ ہرے اور شیطانی چرکوں کے زخم تازہ ہوجاتے ہیں، جذبہ بندگی چھلک پڑتا ہے، فریاد شکستگی، آہ وفغاں میں ڈھلتی ہے، ہچکیاں بندھتی ہیں، اشکوں کا سیلاب امڈتا ہے اور خطاؤں کا انبار، معصیتوں کا غبار بہتا چلا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ عقیدتوں کے اس سفر کی ہر منزل ایک تاریخ ہے۔

منیٰ:......اہل وفا کی لافانی یادگار۔

عرفات:......اہل عشق کا دشت جنون

مزدلفہ:......صحرائے راز ونیاز اور وادی بطحا کی فضائیں انفاس قدسیہ کی امین......!

حج کا سفر وحدت ملی کا بھولا ہوا سبق بھی یاد دلاتا ہے کہ چودہ سو سال پہلے اس بے آب و گیا وادی نے انسانیت کو جینے کا قرینہ سکھانے والی جو تہذیب عطا کی، وہ کسی ایک خطہ یا ایک فرد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس کے ماننے والے ایک ہی ذات کی کبریائی کے قائل، ایک ہی کتاب اور ایک ہی نبی کی درس گاہ سے تعلیم پانے والی ایسی ملت ہے جو بتان رنگ وخون توڑنے کے بعد وجود میں آئی، جس میں جڑنے کے بعد نہ تورانی باقی رہتا ہے، نہ ایرانی، نہ افغانی! یہ وحدت جب تک برقرار رہی، ہماری تاریخ معجزے دکھاتی رہی، اس کی سنگ راہ سے چشمے پھوٹتے، اس کے آگے کہسار دبتے، فاصلے سمٹتے، دریا جمتے، طوفان رکتے، چٹان ریزہ ریزہ ہوتے اور وقت کی جابر آندھی ٹکرا کر از خود تحلیل ہوتی رہی...... سندھ میں قید ایک خاتون کے خط پر ہزاروں میل کے فاصلے سے محمد بن قاسم راجاؤں کی خبر لینے پہنچا اور عموریہ کے قید خانہ سے ایک عورت کے ”وامعتصماہ“ پکارنے پر خلیفہ معتصم بے چین ہوا اور اس وقت تک رہا، جب تک عموریہ فتح کر کے، گرفتار مسلمانوں کو آزادی نہیں دلائی۔

کشمیر نے نوے ہزار شہیدوں کی قربانی دی، فلسطین کے چالیس لاکھ بے گھر ہوئے، افغانستان نے سولہ لاکھ شہداء کا نذرانہ پیش کیا اور احمد آباد نے دو ہزار خواتین اور معصوم بچوں کو جلتے الاؤں میں زندہ جلائے جانے کا غم دیکھا......لیکن اجڑتے افغانستان، لٹتے کشمیر، پٹتے فلسطین اور جلتے احمد آباد کے زخم سہلانے کے لیے نہ کوئی محمد بن قاسم آیا، نہ کوئی معتصم بے تاب ہوا۔

پس اے عقیدتوں کے مسافر!......جب آپ مدینہ منورہ پہنچیں، سید الانبیاء کے آستانہ کی رعنائی و زیبائی، واردات قلب کو ایک جہان تازہ عطا کر دے، گنبد خضرا کی سنہری جالیوں کی محبوبی و دلکشی، دامن دل کھینچ لے تو آنسوؤں کی برسات میں آقائے نامدار کے حضور، چشم تر کا سلام کہنے کے بعد امت کے آزردہ غلاموں کا یہ پیام دینا کہ:

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی　　تلاش جس کی ہے، وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ وگل ہیں، ریاض ہستی میں　　وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں　　جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے، تری امت کی آبرو اس میں　　طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تعلیم وتربیت

اور آج تم سے کیا کہوں لحد کا بھی پتہ نہیں

مفتی ناصر الدین مظاہری

علامات قیامت کے موضوع پر ایک مضمون لکھنا تھا، مجھے میرے کریم وحلیم استاذ حضرت مولانا محمد سلیم قاسمی ناظم کتب خانہ مدرسہ امداد العلوم زید پور بارہ بنکی یاد آرہے تھے، ان سے میں نے ترجمہ قرآن شریف پڑھا تھا، یادوں کے پردے ہٹے اور ہٹتے چلے گئے، ۱۹۹۲ء کا سال ہے، ہم کتب خانہ امداد العلوم میں مولانا کی درسگاہ میں سبق پڑھ رہے ہیں، مولانا بے تکلف و بے تکان تقریر کررہے ہیں، علامات قیامت کا ذکر چل رہا ہے، دجال اور دابۃ الارض پر بیان ختم ہوا تو حضرت مہدی اور حضرت عیسیٰ کے تذکرہ پر پہنچے، وہاں سے اسرافیل اور ان کے صور پر پہنچ گئے، پہلا صور پھونکا گیا، لوگوں پر بیہوشیاں اور مدہوشیاں طاری ہوگئیں، دوسرا صور پھونکا گیا، مردے زندہ ہونے لگے، مولانا نے فرمایا: ایک ایک بالشت زمین سے ستر ستر مردے زندہ ہوں گے، اور پھر مولانا نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں در و دیوار اور چھت کی طرف اشارہ کرکے فرمایا:

اِن دیواروں سے بھی مردے نکلیں گے۔

یہ بات اُس وقت سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ عمر بہت کم تھی لیکن اب سوچتا ہوں تو معصومیت اور لاعلمی کے پردے چاک ہوتے ہیں، حقائق سے پردہ اٹھتا ہے، جنۃ القناعۃ یعنی ’’گلستان قناعت‘‘ نامی کتاب میرے سامنے ہے، مشہور عالم دین مولانا محمد موسی روحانی بازیؒ اس کے مصنف ہیں، مجھے بنی اسرائیل کی ایک کہانی پڑھنے کی توفیق ملتی ہے، جوں جوں کہانی میں اترتا اور آگے بڑھتا جاتا ہوں بچپن کے معصوم اشکالات ایک ایک کرکے کافور ہوتے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل میں

ایک شخص کا انتقال ہوگیا، اس کے دو بیٹے تھے، باپ کے بعد تقسیم وراثت میں ایک دیوار کے معاملہ میں جھگڑا پیدا ہوگیا، اچانک دیوار سے آواز آنے لگی، دونوں بھائی دم بخود ہوکر آواز سننے لگے:

"تم دونوں جھگڑا مت کرو، میری حقیقت یہ ہے کہ میں ایک مدت مدید تک اس دنیا کا عظیم الشان بادشاہ رہا، پھر میرا انتقال ہوگیا، میرا بدن سڑگل کر ختم ہوگیا، میرے بدن نے مٹی کی شکل اختیار کرلی، کمہار نے وہ مٹی اٹھائی اور اس سے گھڑے بنائے، میں ایک مدت تک گھڑے کی صورت رہا، گھڑا ٹوٹ گیا تو ٹھیکروں کی صورت میں پڑا رہا، رفتہ رفتہ ٹھیکروں نے مٹی اور ریت کی شکل اختیار کرلی، پھر لوگوں نے میرے اجزاء بدن سے اینٹیں بنالیں اور آج تم مجھے دیوار میں لگا ہوا دیکھ رہے ہو، لہٰذا تم اس مذموم دنیا پر مت لڑو۔"

کہانی کی یہ رِیل آگے آگے بڑھ رہی تھی اور میرے ذہن و دماغ میں حکم الٰہی گردش کر رہا تھا، ہم جب بھی مردے کو دفن کرتے ہیں تو ایک دعا پڑھتے ہیں جو دعا کم مگر اپنے لئے یاددہانیوں کا ذخیرہ سموئے ہوئے ہے، منھا خلقنٰکم، ہم نے تم کو اسی زمین (مٹی) سے پیدا کیا ہے، وفیھا نعیدکم، اور اسی کی طرف لوٹائیں گے، ومنھا نخرجکم وتارۃ اخریٰ اور پھر دوبارہ اسی سے نکالیں گے، غور کریں، تین مٹھی مٹی، تین وعدے، ہر وعدے کا بدلتا منظر، اللہ اکبر!

میں نے عجائب المخلوقات نامی کتاب میں پڑھا تھا حضرت جبرئیل کہتے ہیں: دنیا میں جہاں پانچ ہزار سال قبل خشکی دیکھی تھی، پانچ ہزار سال بعد وہاں آبادی دیکھی۔

عقل والوں کے لیے کتنی عبرت ہے حضرت جبرئیل کے اس مشاہدہ اور شہادت میں، روئے زمین جس پر ہم چل پھر رہے ہیں ذرا سوچیں کہ پہلے یہ سمندر رہی ہوگی، جن اینٹوں کو ہم اپنی تعمیرات میں لگا رہے ہیں، احساس کریں یہ کسی کے ہاتھ، کسی کے دل، کسی کے دماغ، کسی کے پاؤں اور کسی کے جسمانی اعضاء وجوارح کا معجون مرکب ہے، ان میں ہزاروں لاکھوں سال پہلے مرے ہوئے اچھے برے، کالے گورے، جائز ناجائز انسانوں کی لاشوں کے اعضاء و اجزاء موجود ہیں۔

شاعر نے عجیب بات کہی ہے ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آپڑا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسی کا سر پُرغرور تھا

ذرا توجہ کریں تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ انسان مرنے کے بعد بھی ایک حالت اور کیفیت پر برقرار نہیں رہتا، قبریں اپنی قدریں کھوتی رہتی ہیں، میرے گاؤں مرزاپور لکھیم پور میں مسجد کی دیوار بنائی جانی تھی، بنیاد کھودی جارہی تھی، اچانک مردوں کی ہڈیاں نکلنے لگیں، بعض صحیح سالم جسم نظر آنے لگے، حیرت اور وحشت کا عالم، کیونکہ یہ تو گاؤں کا درمیانی علاقہ ہے، جہاں نہ تو قبر نہ قبرستان، تو پھر مردوں کی یہ ہڈیاں کہاں سے اور کیونکہ برآمد ہونے لگیں؟ بڑے بوڑھوں سے معلوم کیا گیا، انہوں نے بتایا کہ اُنہیں ان کے بڑے بتایا کرتے تھے کہ جہاں مسجد قائم ہے وہاں کسی زمانے میں قبرستان ہوا کرتا تھا۔

اے اونچے اونچے مکان ومحلات اور پلازے بنانے والو! سوچو! تمہارے یہ مکانات تمہارے بعد کسی اور کے پاس ہوں گے، تمہاری بیوی کسی اور کی بیوی بن سکتی ہے، تمہارے بیٹے تمہارے بعد تمہاری خون پسینہ کی کمائی کو لٹا رہے ہوں گے، روئے زمین پر کوئی اور تمہاری دولت و ثروت سے مزے اڑا رہا ہوگا، اس کو تمہاری محنتوں کا کوئی احساس نہ ہوگا، تمہاری قبر ہوگی، تم ہوگے، اور تمہارے اعمال ہوں گے، بس، تمہارے گھر کا کوئی فرد تمہارے پاس نہ ہوگا، تم نے جس مکان کو بڑی چاہ اور بڑے چاؤ سے بنایا تھا کسی اور کی ملکیت ہوگا، مکان بھی تمہاری ہڈیوں کی طرح بہت تیزی کے ساتھ بوسیدہ ہورہا ہوگا، جس مکان کے دروازے پر تم نے خونخوار کتے، بدتمیز دربان اور آہنی سلاخیں لگائی تھیں، وہ سب جوں کی توں ہیں، صرف تم اس گھر سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیئے گئے ہو۔

۲۰۱۴ء میں دریائے گھاگھرا نے ہمارے گاؤں کی زمینوں کے علاوہ قبرستان کو بھی اپنے اندر سمالیا، میرے والدین، عزیز و اقارب، گاؤں کے تمام مردے، سب پانی کے ریلے میں بہہ گئے، اب نہ تو قبریں ہیں نہ ہی قبرستان، مگر قبر والے باقی ہیں، کیونکہ وہ مٹی کی شکل میں پانی میں شامل اور ریت میں داخل ہو گئے، وہ ریت اور مٹی پانی کے ساتھ نقل مکانی اختیار کریں گے، کہیں کھیت کی صورت تو کہیں ریت کی صورت، اب یہ اللہ کا نظام ہے کہ کب تک وہ کس صورت باقی رہتی ہیں اور کب کسی عمارت کا حصہ بنتی ہیں۔

آہ! بعض شعراء کتنے رقت آمیز اشعار کہہ دیتے ہیں ؎

غرور تھا، نمود تھی، ہٹو بچو کی تھی صدا
اور آج تم سے کیا کہوں لحد کا بھی پتہ نہیں

سورۂ مرسلات میں تو خود اللہ تعالیٰ اعلان فرماتے ہیں:

کیا ہم نے زمین کو مردوں اور زندوں کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟''

سورۂ عبس میں اعلان ہوتا ہے:

"پھر اسے موت دے کر قبر میں پہنچادیا پھر جب وہ چاہے گا، اسے زندہ کرے گا۔"

شاید اسی لئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ اور دیواروں کے ذریعہ مضبوط کرنے سے منع فرمایا ہے تا کہ قبریں جلد از جلد زمین کے برابر ہو جائیں...... قبروں کا وجود کھو جائے...... قبروں سے ان کی حالت اور کیفیت کا پتہ نہ چلے...... کیونکہ اللہ تعالیٰ ان قبروں پر بھی نظر کرم فرماتے ہیں جو بوسیدہ ہو کر زمین کے برابر ہو جاتی ہیں۔

☆......☆......☆

اردو ادب

اردو ادب اور صحافت

آصف جیلانی

میں نہ تو ادیب ہوں اور نہ پوری طرح سے ادب شناسی کا دعوی کرسکتا ہوں۔ پھر اتنا بڑا صحافی بھی نہیں کہ اردو ادب اور صحافت کے بارے میں معتبر طور پر کوئی بات کرسکوں۔ ہاں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں صحافت کی دنیا کے اندر کا بھیدی ضرور ہوں۔

آج کے دور میں خلط ملط کا جو رجحان حاوی ہے، اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے نزدیک اردو ادب اور صحافت میں کوئی حد امتیاز باقی نہیں رہی ہے۔ لوگ ہر ادیب کو صحافی اور ہر صحافی کو ادیب سمجھنے لگے ہیں۔

میرے خیال میں ہر وہ چیز جو نثر یا نظم میں لکھی جائے، اسے ادب تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح تو مختلف علوم وفنون کے بارے میں کتابیں، تاریخ اور جغرافیہ، فقہ اور فلسفہ کے بارے میں مضامین، تجارت وصنعت کی رپورٹیں، حتی کہ مردم شماری کے جائزے، یہ سب جو نثر میں لکھے جاتے ہیں، ادب کے زمرے میں شامل کئے جائیں گے اور یوں فقیروں کی منظوم صدائیں اور پھیری لگانے والوں کی گا گا کر بیچنے کی آوازیں، ان سب کو شعری ادب کہنا پڑے گا۔

میرے خیال میں ادب اس شعری اور نثری تخلیق کا نام ہے جو زندگی کو بے جان تصورات میں تحلیل کر کے دیکھنے کے بجائے، پوری حیات انسانی کی منجدھار میں شامل ہوکر اس کی قوت، روانی اور حرارت کو اپنے اندر جذب کرلے۔ اس کے مقابلہ میں صحافت کا بنیادی کام، حالات حاضرہ کے ابلاغ

اور اس کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرنا اور معاشرہ کو صحیح راہ دکھانا ہے۔ یوں صحافت حیات انسانی کی منجدھار کی سمت اور اس کے مختلف پہلوں کی نشاندہی کرتی ہے، اس میں جذب ہو کر نہیں بلکہ علم، ادراک اور تجربہ کی بنیاد پر۔

لیکن جہاں تک اردو ادب اور اردو صحافت کا تعلق ہے، اس کا ایک دوسرے کے ساتھ بڑا گہرا رشتہ رہا ہے۔ اسی زمانہ میں جب اردو زبان، کمسنی کے عہد سے نکل کر شعور کی منزلوں کو چھو رہی تھی، اردو صحافت کا آغاز ہوا۔ یہ انیسویں صدی کا ابتدائی دور تھا اور اسی زمانہ میں، ۱۸۳۶ء کے آس پاس، محمد باقر صاحب نے دلی سے اردو اخبار نکالا اور اکبر آباد سے منشی سدا سکھ لال کی سرپرستی میں اخبار "نور البصار" نکلا۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو صحافت نے اردو ادب اور ادیبوں کو عوام سے روشناس کرایا اور یہ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اردو ادب، صحافت کے ذریعہ ہی مقبول عام ہوا اور پروان چڑھا۔

شاعری کے بارے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے جو فروغ ملا اور عوام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس میں شاہی درباروں اور مشاعروں کا بڑا ہاتھ تھا لیکن اردو نثر کی ترقی خالص، صحافت کی مرہون منت رہی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے "ہمدرد"، سرسید کے رسالے "تہذیب الاخلاق"، مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "الہلال" اور "البلاغ"، بنارس کے اردو اخبار "آوازہ اخلاق"، کانپور کے "زمانہ"، حسرت موہانی کے رسالے "اردوئے معلیٰ" اور امتیاز علی تاج کے "کہکشاں" اور مولانا ظفر علی خان کے اخبار "زمیندار" نے اردو نثر کے ساتھ نظم کی ترقی اور ترویج میں جو اہم حصہ ادا کیا ہے، وہ اردو ادب کی تاریخ کے لئے قابل فخر ہے۔

سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اردو کے ادیبوں کا ایک بڑا گروہ جمع کیا تھا جس میں مولانا حالی، مولانا شبلی، ڈاکٹر نذیر احمد خان، ذکا اللہ خان، محسن الملک اور چراغ علی نمایاں ہیں۔

مولانا حالی نے جب اپنی مسدس سرسید کو بھیجی اور یہ پیش کش کی کہ اس کا حق تصنیف سرسید کے مدرستہ العلوم کے نام کر دیا جائے تو اس کے جواب میں سرسید نے لکھا تھا:

"میں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کا آئینہ یا اس کے

ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں، قوال درگاہوں میں گاویں۔ حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں، اس سے اسی قدر مجھے خوشی ہوگی۔ میں اس مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا۔"

اور اردو ادب کا یہ شہ پارہ، سرسید کے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ عوام میں مقبول ہوا۔

مولانا محمد علی جوہر کے ہمدرد نے جہاں ایک طرف عوام میں سیاسی شعور بیدار کیا اور ان کی آزادی کی جدوجہد میں مدد کی وہاں اردو نثر کو بھی مالا مال کیا۔

پریم چند کا پہلا ناول "اسرار معابد" بنارس کے آوازہ اخلاق میں قسط وار شایع ہوا تھا اور اسی طرح ان کے دوسرے ناول اور افسانے، کانپور کے زمانہ میں شایع ہوئے۔

اردو ادب میں نثر کا وہ ابتدائی دور جب کہ رومانیت اپنے عروج پر تھی اور ادب لطیف کی اصطلاح عام تھی اس کو خان بہادر ناصر علی کے اخبار "صلاح عام" دلی اور نیاز فتح پوری کے نگار نے بڑھاوا دیا۔ نیاز فتح پوری خود اُس زمانہ میں شعری منشورات کے ماہر تھے۔ یہ زمانہ ۱۹۲۰ اور ۲۱ء کا تھا۔ اسی زمانہ میں سجاد حیدر یلدرم، نصیر حسین خیال اور مجنوں گورکھپوری ابھرے۔ ان کے شہ پاروں کو گورکھپور کے رسالے "سبحان" اور "مشرق"، کانپور کے "ادیب اردو"، بدایوں کے "نقیب" نے عوام میں مقبول کیا۔ خود مجنوں گورکھپوری کے مجلہ "ایوان" نے جو انھوں نے ۱۹۳۰ء میں گورکھپور سے جاری کیا تھا، اردو ناول اور افسانہ نگاری کی ترقی میں کافی نمایاں رول ادا کیا۔

اردو میں طنز و مزاح کو جو فروغ حاصل ہوا وہ خالص اردو صحافت کی دین ہے۔ اس صنف کا آغاز سرشار اور سجاد حسین سے ہوتا ہے جنہوں نے اپنے مزاحیہ مضامین کی ابتداء اودھ پنچ سے کی۔ خود سجاد حسین اس زمانے میں اودھ پنچ کے ایڈیٹر تھے۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت ہجر، منشی احمد علی کسمنڈوی اور جوالا پرشاد برق اسی زمانہ کے نامور مزاح نگار تھے۔

بعد کے طنز و مزاح نگار، رشید احمد صدیقی، ملا رموزی، پطرس، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی اور کنہیا لال کپور کتابی طنز و مزاح نگار ہیں۔ بعد کی مزاح نگار نسل میں چراغ حسن حسرت، ابراہیم

جلیس، ابن انشا، نصر اللہ خان، مجید لاہوری، حاجی لق لق، فکر تونسوی، طفیل احمد جمالی اور عطاالحق قاسمی وغیرہ ان سبھوں نے اردو صحافت کے ذریعہ اپنی تخلیقات کو جلا دی اور عوام تک پہنچایا۔ اس نسل کے مزاح نگاروں میں ایک بڑا نام مشتاق احمد یوسفی کا ہے لیکن وہ براہِ راست حساب کتاب سے کتاب تک آئے ہیں۔

بلاشبہ یہ اردو صحافت کی خوش نصیبی ہے کہ اردو ادب کے ممتاز دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے اردو صحافت کی عملی طور پر رہنمائی کی ہے جن میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، حیات اللہ انصاری، غلام رسول مہر اور مولانا جالب نمایاں ہیں اور آزادی کے بعد، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، چراغ حسن حسرت اور سبط حسن کے نام درخشاں رہے ہیں لیکن اسے بدقسمتی کہہ لیں یا بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے کہ جب سے اردو صحافت نے تجارت کا لبادہ اوڑھا ہے ایڈیٹری خاندانی میراث بنتی جا رہی ہے۔ اس مسند پر ممتاز ادیبوں کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے۔

پاکستان میں اردو ادب کا جہاں تک تعلق ہے، اس کے معیار سے قطع نظر اس کی اشاعت اور ترویج میں سیاست یا یوں کہہ لیں سیاست پر فوجی پہروں کا بڑا دخل رہا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں جب پہلی بار فوج نے اقتدار پر شب خون مارا اس کے بعد ایک عرصہ تک اردو صحافت نے راہِ فرار اختیار کی اور اس زمانہ میں صحافت نے ادب اور ادبی سرگرمیوں کا سہارا لیا۔ اُس وقت بہت سے لوگ کہتے تھے کہ پاکستان میں اردو اخبارات بڑی حد تک میگزین بن کر رہ گئے ہیں۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ پاکستان میں اردو اخبارات نے جہاں اردو ادب کو عوام تک پہنچانے اور مقبول بنانے اور شاعروں اور ادیبوں کے تعارف و تشہیر میں اہم حصہ ادا کیا ہے، وہاں اردو زبان کی ہیئت بگاڑنے میں بھی اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

ویسے تو پاکستان کے پورے معاشرہ کے ہر شعبہ میں معیار کی پستی کا مرثیہ عام ہے لیکن صحافت کو ایک عرصہ تک زباں بندی کے ساتھ ساتھ زبان کی ابتری کے سنگین مسئلہ کا بھی سامنا رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ سائنس اور دوسرے علوم کی فنی اصطلاحات کے اردو میں مناسب ترجموں کی کوشش کو فوقیت

دی جاتی تھی لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ بالکل رک گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت جب ۱۹۵۶ء میں آئین نافذ ہوا تو امروز نے پریزیڈنٹ ہاؤس کا ترجمہ ایوان صدر رائج کیا لیکن پھر بھٹو کے دور میں اس کی جگہ پریزیڈنسی عام ہو گیا۔ اب اردو اخبارات اور حتی کہ اردو ناولوں اور افسانوں میں بھی اچھے اچھے اردو کے الفاظ کی جگہ انگریزی الفاظ لیتے جا رہے ہیں اور بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے منظم طور پر اردو کو "انگریزیا" جا رہا ہے۔ اردو کے وہ الفاظ جن پر انگریزی مسلط ہو گئی ہے، ان کی اتنی بھرمار ہے کہ پوری ایک لغت تیار ہو سکتی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کے درمیان انگریزی کی فصیل کھڑی کی جا رہی ہے اور اردو کو علاقائی زبانوں کی دولت سے فیض یاب ہونے کی راہ مسدود کی جا رہی ہے۔

ایک بات جو مجھے اردو ادب اور صحافت میں آج کل مشترک نظر آ رہی ہے، وہ ہے کہ جس طرح آج اردو صحافت میں نہ کوئی نظری سمت ہے اور نہ کوئی منزل اور مقصدیت ہے، اسی طرح اردو ادب میں بھی جیسا کہ مجنوں گورکھپوری نے کہا تھا کہ:

> "ایسا لگتا ہے کہ جس کو دیکھو وہ گویا نشیب وفراز سے بے خبر ایک بے جانے بوجھے راستے پر چل رہا ہے۔ ہماری ادبی دنیا میں آج نراج کا سا ہے۔ آج ادب نام ہے اپنی اپنی ڈفلی اور اپنے اپنے راگ کا۔ آج ادب میں جو بڑھتی ہوئی انفرادیت پائی جاتی ہے۔ وہ یقیناً سقیم اور غیر صحت مند ہے۔"

غرض موجودہ صورت حال امید افزا نظر نہیں آتی اور اردو زبان کے ابتدائی دور میں ادب اور صحافت میں ایک دوسرے کو سہارا دینے کا جو رجحان اور رویہ تھا، اور اس میں جو ایک رومانی مقصدیت تھی وہ اب عنقا ہوتی جا رہی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات بہت سے لوگوں کو تلخ لگے لیکن کیا کیا جا سکتا ہے کہ حقیقت عام طور پر تلخ ہی ہوتی ہے۔

کتابیں ہیں چمن اپنا

بدائع الصنائع

مفتی محمد ساجد میمن

کچھ مصنف کے بارے میں: آپ کا نام نامی ،نسب گرامی ابوبکر بن مسعود بن احمد کاسانی ہے، لقب ملک العلماء اور علاؤالدین ہے۔آپ کا شمار ائمہ کبار اور فقہائے نامدار میں ہوتا ہے، آپ چھٹی صدی ہجری کے مشہور حنفی عالم ہیں، آپ کی تاریخ ولادت کے ذکر سے کتب تاریخ وسیرت خاموش ہیں۔

''کاسان'' کی تحقیق: لفظ ''کاسان'' کے بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں:

(۱)......امام زرکلی نے ''الاعلام'' میں ''کاشان'' ذکر کیا ہے۔(۱)

(۲)......امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ ''قاسان'' ہے، جو ترکستان میں نہر سیحون کے عقب میں واقع ہے۔(۲)

(۳)......''کاسان''، ترکستان کا ایک شہر جو 'نہر سیحون اور 'شاش'' کے عقب میں واقع ہے، اس کا شمار دنیا کے خوبصورت اور حسین شہروں میں ہوتا تھا، ترکیوں کے حملے میں تباہ وبرباد ہوگیا۔(۳)

حصول علم، اساتذہ وتلامذہ: آپ نے اپنے زمانہ کے نابغۂ روزگار علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے، لیکن باعث حیرت بھی ہے اور افسوس بھی کہ آپ کے سوانح نگاروں نے آپ کے اساتذہ کا ذکر نہیں کیا، کتب سیر وتاریخ میں صاحب تحفۃ الفقہاء علامہ علاء الدین سمرقندیؒ کے علاوہ آپ کے اساتذہ کا کوئی تذکرہ نہیں۔

آپ تاحیات درس وتدریس، فتاویٰ نویسی میں مشغول رہے اور علماء وطلبہ کے ایک جم غفیر نے آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا، لیکن یہاں بھی افسوس کے ساتھ یہی کہنا پڑ رہا ہے کہ سوانح نگاروں نے آپ

کے تلامذہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔آپ کے تلامذہ میں صرف آپ کے صاحبزادے ''محمود'' اور احمد بن محمود الغزنوی مؤلف ''المقدمة الغزنوية'' کا تذکرہ ملتا ہے۔

رسوخ فی العلم: اللہ تبارک وتعالیٰ نے امام موصوف کو علم وافر اور تفقہ فی الدین کامل درجہ میں عطا فرمایا تھا، سیرت نگاروں نے اس سلسلے میں آپ کے دو واقعات ذکر کیے ہیں، جن سے آپ کے رسوخ فی العلم کا اندازہ ہو جائے گا۔

پہلا واقعہ: ایک مرتبہ بلاد روم کا ایک فقیہ آپ سے اس مسئلہ میں مناظرہ کرنے آیا کہ ''اگر کسی مسئلہ میں دو مجتہدوں کا اختلاف ہو تو کیا دونوں حق پر ہیں یا ایک حق پر اور دوسرا ناحق پر؟''

رومی فقیہ کا کہنا یہ تھا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک دونوں حق پر ہیں۔ جب کہ علامہ کاسانیؒ کا کہنا یہ تھا کہ نہیں، امام ابوحنیفہؒ کا مسلک اس بابت یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک حق پر ہے اور دوسرا ناحق پر اور آپ کا جو قول ہے، یہ امام ابوحنیفہ کا نہیں بل کہ یہ تو معتزلہ کا قول ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ میں رومی فقیہ اور علامہ کاسانی کے درمیان طویل مکالمہ اور مباحثہ ہوا اور بات طول اختیار کر گئی جس پر علامہ کاسانی نے غصہ میں آکر اس فقیہ کو مارنے کے لیے لاٹھی اٹھالی۔ جب اس بات کی خبر رومی بادشاہ کے صاحبزادے کو ہوئی تو اس نے غصہ میں کہا: ''اس کی یہ جرات کہ ہمارے فقیہ پر ہاتھ اٹھائے، اس کو ملک بدر کر دو''۔تو اس کے وزیر نے اس کو سمجھایا کہ ایسا فیصلہ اور حکم مت جاری کرو، یہ قابل احترام اور معزز شخصیت ہیں، ان کو ملک بدر کرنا مناسب نہیں، آپ ایسا کریں کہ ان کو بادشاہ نورالدین محمود کی خدمت میں بھجوادیں، چنانچہ آپ کو نورالدین محمود کی خدمت میں حلب بھجوادیا، نورالدین محمود نے آپ کو حلب کی ولایت عطا فرمائی۔(۴)

دوسرا واقعہ: ابوعبداللہ قاضی العسکر فرماتے ہیں: جب علامہ کاسانیؒ دمشق تشریف لائے تو وہاں کے فقہاء وعلماء ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے چند مسائل میں گفتگو کرنا چاہی تو آپؒ نے فرمایا: ''میں کسی ایسے مسئلہ میں گفتگو نہیں کروں گا جس میں فقہائے احناف میں سے کسی کا کوئی قول منقول ہو (بل کہ ایسا مسئلہ پیش کرو جس میں فقہائے احناف سے کوئی قول مروی نہ ہو)، چنانچہ تم لوگ

کوئی ایک مسئلہ متعین کرلو جس میں یہ شرط پائی جاتی ہو تو میں کلام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ چنانچہ ان فقہاء نے بہتیرے مسائل پیش کیے، آپ ہر مسئلہ کے بارے میں فرماتے کہ یہ میری شرط پر پورا نہیں اترتا کیوں کہ فلاں فلاں حنفی امام کا مسلک اس مسئلہ میں یہ منقول ہے......فرماتے ہیں کہ وہ مسائل پیش کرتے رہے اور آپ ہر مسئلہ میں کسی نہ کسی حنفی امام کا مسلک بیان کرتے رہے، یہاں تک وہ لوگ تھک ہار گئے اور مجلس تکلم اختتام پذیر ہوگئی۔(۵)

وفات: ۱۰ رجب، ۵۸۷ھ بروز بعد نماز ظہر آپ کا انتقال ہوا، حلب کے قبرستان میں مقام ابراہیم خلیل اللہ میں اپنی زوجہ محترمہ فاطمہ کے پہلو میں آپ مدفون ہیں۔

ابن عدیم کہتے ہیں کہ میں نے ضیاء الدین حنفی سے سنا کہ علامہ کاسانیؒ کی وفات کے وقت میں ان کی خدمت میں موجود تھا، بوقت نزاع آپ سورۂ ابراہیم پڑھ رہے تھے جب اس آیت {یثبت الله الذین آمنوا بالقول الثابت فی الحیوٰۃ الدنیا و فی الآخرۃ}(۶) پر پہنچے تو آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

کرامت: سیرت نگاروں کے بقول آپ کی اور آپ کی اہلیہ کی قبر پر دعائیں قبول ہوتی ہیں۔(۷)

تصنیفات و تالیفات: علامہ کاسانیؒ کی صرف دو تصانیف کا ذکر ملتا ہے: (۱)......"**السلطان المبین في أصول الدین**"۔(۲)"**بدائع الصنائع في ترتیب الشرائع**" اس وقت یہی کتاب ہمارے زیر تعارف ہے۔

زیر تعارف کتاب بدائع الصنائع: "**بدائع الصنائع**" کا شمار فقہ حنفی کی جلیل القدر اور عظیم الشان کتب میں ہوتا ہے۔ ہزاروں مسائل و جزئیات پر مشتمل یہ کتاب اسم بامسمیٰ ہے۔علامہ کاسانی نے علامہ علاء الدین سمرقندیؒ کی مشہور کتاب "**تحفة الفقهاء**" کو اپنی اس کتاب کے لیے بنیاد بنایا ہے۔ کتاب کے مزید تعارف سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف **تحفة الفقهاء** کے مختصر حالات زندگی پیش کردیے جائیں۔

مؤلف تحفة الفقهاء: آپ کا نام ونسب اس طرح ہے: "محمد بن احمد بن ابی احمد سمرقندی"

آپ کی کنیت ابوبکر اور لقب علاء الدین تھا۔ اپنے زمانہ کے مایہ ناز فقہاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ نے صدر الاسلام ابو الیسر محمد بن محمد بن عبد الکریم البزدوی اور ابو المعین میمون بن محمد مکحولی سے علم حاصل کیا۔ آپ کے مشہور تلامذہ میں آپ کی صاحبزادی فاطمہ، علامہ کاسانیؒ (صاحب **بدائع الصنائع**) اور صاحب **ھدایہ** کے استاذ محمد بن حسین بن ناصر البزنجی جیسے حضرات شامل ہیں۔

آپ کی وفات کے بارے میں مختلف اقوال ہیں: (۱) ...... ۵۳۹ھ (۲)...... ۵۵۲ھ (۳)...... ۵۵۳ھ (۴)...... ۵۷۵ھ (۵)...... ۵۴۰ھ۔ (۸)

صاحب تحفہ کی صاحبزادی ''فاطمہ'': آپ کا نام فاطمہ بنت محمد بن احمد سمرقندی ہے۔ آپ نے علم فقہ اپنے والد سے حاصل کیا اور اپنے والد کی تالیف کردہ کتاب ''**تحفة الفقھاء**'' آپ کو از بر تھی۔ آپ کا شمار اپنے زمانہ کی حسین اور خوب صورت عورتوں میں ہوتا تھا، جس کی بنا پر روم کے مختلف بادشاہوں نے آپ سے نکاح کا پیغام دیا لیکن آپ کے والد نے قبول نہ کیا، جب علامہ کاسانیؒ نے **بدائع الصنائع** لکھ کر علامہ سمرقندی کی خدمت میں پیش کی تو آپ اس قدر خوش ہوئے کہ اپنی صاحبزادی کا نکاح علامہ کاسانی کے ساتھ کر دیا اور بدائع الصنائع کو اپنی صاحبزادی کا مہر قرار دیا۔ (۹)

ابن العدیم فرماتے ہیں کہ مجھے میرے والد نے بتایا:

> ''فاطمہ، نقلِ مذاہب میں خوب ماہر تھیں، یہاں تک کہ جب ان کے شوہر علامہ کاسانی کسی مسئلہ میں پھنس جاتے تو فاطمہ اپنے شوہر کی رہنمائی کرتی تھیں، اور علامہ کاسانی خود بعض اوقات حلِ مسائل کے لیے فاطمہ سے مدد لیتے تھے۔ آپ اپنے زمانہ کی ماہر مفتیہ تھیں، جب وہ کنواری تھیں تو فتوے پر ان کے اور ان کے والد علامہ سمرقندی کے دستخط ہوتے تھے، جب علامہ کاسانی سے ان کا عقد نکاح ہوا تو فتوے پر ان تینوں حضرات کے دستخط ہوا کرتے تھے''۔ (۱۰)

علامہ کاسانیؒ اور فاطمہ کی شادی کے حوالے سے ایک تحقیق: بدائع الصنائع کے مترجم جناب ڈاکٹر محمود الحسن عارف صاحب، علامہ کاسانیؒ اور فاطمہ کی شادی کے اس واقعہ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> ''بعض اوقات سوانح نگار نہایت نیک نیتی سے کوئی ایسی غلطی کر جاتے ہیں، جس سے کسی

شخصیت کی ذات ہی نہیں بلکہ اس کی زندگی اور اس کے کارنامے مدہم ہو کر رہ جاتے ہیں، الکاسانی کی کتب متذکرہ میں بھی ہمیں اس قسم کی صورت حال نظر آتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہاں اس غلطی کا آغاز عبد القادر ابن ابی الوفاء صاحب **الجواھر المضیۂ فی طبقات الحنفیہ** سے ہوا، وہ الکاسانی کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

''اور ان کے استاد محترم (شیخ) نے ان کی شادی اپنی صاحبزادی سے کر دی، جو فقیہ اور عالمہ تھیں، کہا جاتا ہے کہ ان کے استاد محترم نے اپنی بیٹی اس لئے ان کے ساتھ بیاہ دی تھی کہ وہ حسین وجمیل خاتون تھیں اور اس نے اپنے والد کی کتاب **تحفہ** کو زبانی یاد کر رکھا تھا۔ چنانچہ روم (اشیائے کوچک) کے بہت سے بادشاہ (امراء) اس سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے، مگر ان کے والد نے ان کے پیغامات قبول نہ کئے۔ اسی اثناء میں الکاسانی آ گئے اور اس کے والد کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور ان کی خدمت میں رہ کر انہوں نے علم اصول اور فقہ میں مہارت تامہ بہم پہنچالی اور کتاب **البدائع** تصنیف کی، جو **تحفہ** کی شرح ہے، اور اسے اپنے استاد محترم کی خدمت میں پیش کیا تو استاد اس پر بہت خوش ہوئے، اور اس سے اپنی بیٹی بیاہ دی اور اس کا مہر اسی کتاب کو قرار دیا۔ ان کے زمانے کے فقہاء نے اس پر کہا کہ: ''الکاسانی نے ان کے **تحفہ** کی شرح لکھی اور السمر قندی نے ان سے اپنی بیٹی بیاہ دی۔''

اس روایت پر جیسا کہ ہم آگے تفصیل سے بیان کریں گے، ہمیں سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس سے فقہ حنفی کی عظیم ترین کتاب کی قدر و قیمت نہ صرف یہ کہ گھٹ جاتی ہے، بلکہ ہمارے خیال میں صدیوں تک اس کتاب سے بے توجہی کا اہم ترین سبب بھی یہی روایت رہی ہے، مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ اس روایت کو بلا سوچے سمجھے ہر تذکرہ نگار نے آگے سے آگے نقل کر دیا اور کسی نے بھی اصل کتاب **بدائع** اٹھا کر دیکھنے اور مطالعہ کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی، اس ضمن میں طاش کبریٰ زادہ، ابن قطلو بغا (صاحب **تاج التراجم**) حاجی خلیفہ (**کشف الظنون**) فقیر محمد جہلمی صاحب **حدائق الحنفیہ**، یوسف الیان سرکیس اور براکلمان وغیرہ مصنّفین کا نام لیا جاسکتا ہے جنہوں نے اصل ماخذ کو بھی حذف

کر کے نہایت وثوق کے ساتھ اسی روایت کو نقل کر دیا ہے اور نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ حاجی خلیفہ اور برکلمان دونوں نے اس کتاب کو مستقل کتاب کے بجائے **''تحفہ''** کی شرح کے طور پر پیش کیا ہے، چنانچہ مذکورہ دونوں کتابوں میں اس کی تفصیل **تحفة الفقھا** کے تحت ہی دی گئی ہے۔ہمیں اس روایت پر روایت اور روایت کے مسلمہ اصول کے مطابق حسب ذیل اعتراضات ہیں:

(الف):......اس روایت کا سلسلہ عبد القادر بن ابی الوفا تک پہنچتا ہے، اس سے آگے کسی اور کتاب میں اس روایت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ جب کہ عبد القادر مذکور اور الکاسانی کے مابین تقریباً دو صدیوں کا فاصلہ ہے، پھر چونکہ عبد القادر نے اس کے اصل راوی کا بھی ذکر نہیں کیا، لہذا یہ روایت منقطع ہونے کے باعث قابل اعتماد نہیں ہوسکتی۔

(ب): ......عبد القادر مذکور نے بھی اس روایت کو ''**قیل**'' کے ساتھ نقل کیا ہے جو خود مصنفؒ کے ہاں بھی نا قابل اعتبار اور ضعیف ہونے کی دلیل ہے۔

(ج): ...... پھر جیسا کہ ہم اس بحث کے دوسرے حصے میں بیان کریں گے، **بدائع الصنائع** کی داخلی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب السمر قندی کی وفات کے بعد تصنیف کی گئی ہے، لہذا اس روایت کا تمام تانا بانا ہی غلط معلوم ہوتا ہے۔

(د):......علاوہ ازیں جیسا کہ مستشرق (Heffenlng) نے لکھا ہے یہ کتاب شروح ہونے کی ادنیٰ خصوصیات سے بھی عاری ہے، اس لئے کہ عام طور پر یا تو شرح لفظی ہوتی ہے، اور یا پھر معنوی، مگر زیر نظر کتاب میں یہ دونوں باتیں مفقود ہیں۔

(ھ):......خود کتاب کے دیباچے میں صاحب **تحفہ** کی ترتیب اپنانے کا ذکر تو ہے، مگر ان کی کتاب کی شرح کرنے کا ذکر نہیں، اس لئے اسے تحفہ کی شرح قرار دینا مدعی سست گواہ چست والی بات ہے۔

(و):......مزید برآں اس روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ ''اسے السمر قندی نے اپنی بیٹی کا مہر قرار دیا''۔

حالانکہ حنفی فقہ کی رو سے مال متقوم (نقدی اور سونا چاندی) کے علاوہ کوئی اور شے مہر نہیں

ہوسکتی، لہٰذا حنفی فقہ کے رو سے بھی یہ روایت غلط قرار پاتی ہے، اس لئے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انہیں یا تو اس مسئلے کا علم نہ تھا یا پھر انہوں نے دانستہ ایسا کیا، حالانکہ یہ دونوں باتیں ہی غلط ہیں۔

بہر حال ہمارے خیال میں یا تو روایت بنیادی طو پر ہی غلط ہے یا پھر اس میں **بدائع الصنائع** کا نام شامل کرنا راویوں کی بھول ہے، اس لئے کہ عین ممکن ہے کہ الکاسانی نے فی الواقع **تحفه** کی شرح لکھی ہو، مگر اس شرح کا نام راوی کے حافظے سے نکل گیا ہو یا اسے **تحفه** کی اصل شرح کا نام ہی معلوم نہ ہو، اس نے اپنی یادداشت سے اس میں **بدائع الصنائع** کے نام کا اضافہ کر دیا ہو بایں ہمہ اس میں جملے **و جعله مهر ابنته** (اور اسے السمر قندی نے اپنی بیٹی کا مہر قرار دیا) کی تصدیق نہیں کی جاسکتی، زیادہ سے زیادہ اسے تقریب نکاح کا ایک سبب قرار دیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ السمر قندی کی صاحبزادی فاطمہ عالمہ فاضلہ ہونے کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کی دولت سے بھی آراستہ تھیں، اسی لئے بڑے بڑے رئیس ان سے شادی کرنے کے خواہاں تھے مگر ان کے والد کی نگاہ کسی اور ہی شخص کی متلاشی تھی پھر جب الکاسانی وہاں طلب علم کے لیے آئے اور ان کے دامن سے وابستہ ہوکر علم و عرفان کی منزلیں طے کرنے لگے، تو استاد کی نگاہِ انتخاب نے اپنا گوہر مراد تلاش کرلیا، یوں الکاسانی شاگرد سے داماد بن گئے اور بقیہ زندگی اسی آستانے سے وابستہ ہوکر بسر فرمائی۔

(مقدمہ بدائع الصنائع مترجم: ۱/ ۲۹)

کتاب کا نام اور وجہ تسمیہ: کتاب کا پورا نام ''**بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع**'' ہے۔ یہ کتاب اسم بامسمیٰ ہے، مصنفؒ نے جس حسنِ ترتیب کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا ہے وہ اپنی مثال ہے، کتاب کی وجہ تسمیہ کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی اس تالیف کا نام ''**بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع**'' رکھا، کیوں کہ اس میں میرا انداز انوکھا اور نرالا ہے، اور ہر مسئلے کو اس قدر سلیقے سے ایک دوسرے سے مربوط کیا ہے جیسے موتی ہار میں، تاکہ اسم بامسمیٰ ہو اور ظاہر، باطن کے ہم آہنگ ہو''۔(۱۱)

سببِ تالیف: مقدمہ میں کتاب کا سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے مصنف نے جو وجہ لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''کسی بھی فن میں تصنیف وتالیف کا اصل مقصد یہی ہے کہ طالبین کو استفادہ میں سہولت اور آسانی ہو اور اس فن کے معانی اور مباحث کو سمجھنا اس کے لیے آسان ہو اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا کہ جب تک کتاب کو بہترین انداز میں مرتب نہ کردیا جائے، اس کے لیے ضروری امر یہ ہے کہ ہر باب، فصل اور مسئلہ کو غور وفکر کے ساتھ دیکھا جائے اور اصول کلیہ کے مطابق ان کی تخریج کی جائے......(مصنف فرماتے ہیں کہ) میں نے اپنی اس تالیف میں ان جملہ امور رعایت رکھی ہے تاکہ استفادہ کرنے میں آسانی ہو اور اس کتاب کی تالیف میں، میں نے ''تحفۃ الفقہاء'' کو بنیاد بنایا ہے''۔(۱۲)

''بدائع الصنائع'' اہل علم کی نظر میں!: کسی بھی کتاب کے معتبر اور قابل استناد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہر زمانہ میں علماء وفقہاء نے اس کو قبول کیا ہو اور اس سے استفادہ کیا ہو، بدائع الصنائع ایسی کتاب ہے جو ہر زمانہ میں علماء وفقہاء کا مرجع رہی ہے اور اس کا شمار فقہ حنفی کی عدیم النظیر کتب میں ہوتا ہے۔ ذیل میں چند مایہ ناز محققین علماء وفقہاء کے اقوال نقل کرتے ہیں، جس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوجائے گا۔

خاتمۃ المحققین علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

''قوله: (كما في البدائع) هذا الكتاب جليل الشأن، لم أر له نظيرًا في كتبنا، وهو للإمام أبي بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني شرح به ''تحفة الفقهاء'' (۱۳)

یعنی ''بدائع الصنائع عظیم الشان کتاب ہے، میں نے اپنی کتابوں میں اس کی نظیر نہیں دیکھی''۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

''عراقی فقہاء حنفیہ کی تالیفات میں خراسانی فقہاء حنفیہ کی نسبت زیادہ رسوخ واتقان پایا جاتا ہے لیکن کتاب البدائع باوجود یہ کہ اس کا مؤلف ملک العلماء ابوبکر کاشانی، خراسانی

ہے مگر اسکی یہ کتاب اتقان وثبت میں فقہائے عراق کی مثل ہے بلکہ حسن ترتیب میں ہمارے فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ کی تمام کتابوں سے فائق ہے، یہ نہایت نادر المثال کتاب ہے، اگر کوئی عالم ژرف نگاہی اور دقت نظر سے اس کا مطالعہ کرے تو وہ فقیہ النفس بن جائے، یہ کتاب مدرس اور مؤلف کے لیے ''مغنی'' کی بنسبت زیادہ مفید ہے''۔(۱۴)

حضرت مولانا مفتی محمود گنگوہیؒ، علامہ کشمیری کا قول نقل کرتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''صاحب بدائع الصنائع ایسا آدمی ہے کہ قرآن وحدیث کا مغز نکال کر رکھ دیتا ہے''۔(۱۵)

''بدائع الصنائع'' سے متعلق حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے ارشادات:

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے تذکرے میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ لکھتے ہیں:

''اوقات فراغ میں حضرت ''بدائع'' کو اکثر دیکھا کرتے، بارہا سنا ہے کہ حضرت اس کے مصنف کو بہت دعائیں دیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ واقعی یہ شخص فقیہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسکو فقہ ہی کے واسطے پیدا فرمایا تھا''۔

مولوی ظفر احمد صاحبؒ نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت فقہ سے مناسبت پیدا ہونے کی کوئی صورت ارشاد فرمائیں، فرمایا:

''مفتیوں کی عادت یہ ہے کہ صرف استفتاء آنے کے وقت کتابیں دیکھتے ہیں اس سے کام نہیں چلتا اور جواب میں بہت غلطی ہوجاتی ہے کیونکہ اس وقت جلدی میں ایک جگہ کو دیکھ کر جواب لکھ دیتے ہیں حالانکہ دوسرے مقام پر اس مسئلہ کے اندر کافی تفصیل حاصل ہوتی ہے جس سے اس واقعہ مسئولہ کا حکم بدل جاتا ہے، پس فقہ سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے ''شامی'' اور ''بدائع'' کو بالاستیعاب دیکھنا چاہیے۔''

حضرت گنگوہیؒ نے شامی کو کئی بار بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا ہے، اس وقت ''بدائع'' مطبوع نہیں تھی، اب میں شامی کے ساتھ اس کے مطالعہ کو بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

حقیقت میں ''بدائع'' عجیب کتاب ہے، ایک بار فرمایا کہ ''جزئیات تو شامی میں زیادہ ہیں مگر اصول اور فقہ کی لمہ زیادہ بدائع میں ہیں کہ اس سے مناسبت ہوجائے تو فقہ میں طبیعت چلنے لگے''۔(۱۶)

فقیہ الامت مفتی محمود گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''**بدائع الصنائع**'' دیکھیے، اس میں اصول اور لمہ بہت زیادہ ہیں۔ جزئیات کے لیے ''شامی'' دیکھیے۔(۱۷)

چند اصطلاحات: ہر مصنف کی چند مخصوص اصطلاحات اور عادات ہوتی ہیں، جنہیں جانے بغیر اس کی کتاب سے استفادہ کرنا ممکن نہیں ہوتا، چنانچہ علامہ کاسانیؒ نے بھی اپنی اس کتاب **بدائع الصنائع** میں چند اصطلاحات ذکر کی ہیں، ذیل میں ان کی مراد پیش ہے:

(۱)...... **قال مشائخنا، یامشایخ العراق، یامشائخ بلخ، یامشائخنا بما وراء النهر یا بعض مشائخنا**، اس سے مراد ان علاقوں کے وہ فقیہ ہوتے ہیں، جو اپنے علم وفضل کی بنا پر شیخ (جمیع شیوخ ومشائخ) کا درجہ حاصل کر لیتے تھے۔

مشائخ کی یہ اصطلاح دیگر مصنّفین کے ہاں قدر مشترک کے طور پر ملتی ہے، چنانچہ **مختصر القدوری** اور **هدایه** میں بھی اس کا بکثرت استعمال ہوا ہے، مولانا عبدالحئی لکھنوی نے اس کی تشریح میں صاحب **عنایه** کے حوالے سے ''علماء'' اور علامہ قاسم کے حوالے سے ایسے فقہا مراد لیے ہیں جن کی امام ابوحنیفہؒ سے ملاقات نہیں ہوئی۔

(۲)......علامہ کاسانی نے کتاب کے اندرونی حوالے بھی بکثرت دیئے ہیں، جن کا مقصد کتاب میں ایجاز واختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے قاری کی توجہ سابقہ یا آئندہ مباحث کی طرف دلانا ہے، چنانچہ اس ضمن میں کسی آیت کی طرف توجہ دلانے کے لیے ''**بما تلونا**''، روایت کی طرف توجہ دلانے کے لیے **بمارو ینا**، جبکہ عقلی وقیاسی استدلال کے لیے **فیما ذکرنا** و **لما بینا** اور **ما قلنا** کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، تاہم بعض مقامات پر **فیما ذکرنا ما بینا** اور **ماقلنا** سے مراد کسی قول کا مکمل استدلال بھی ہوتا ہے، جس میں قرآن وسنت اور عقلی تینوں طرح کے عقلی دلائل شامل ہوتے ہیں۔ بعض جگہ ''**الفقه فيه**'' لکھتے ہیں اور اس سے عقلی وفکری استدلال مراد لیتے ہیں۔

(۳)...... **یمکن ان یحمل یا هذا الحدیث محمول علی، یا ویحمل** کے الفاظ سے کسی

حدیث کی تاویل بصیغہ جمع کرتے ہیں، جس سے مراد وہ تاویلات ہوتی ہیں جو دیگر ائمہ نے کی ہیں، اور اگر وہ حدیث کی کسی تاویل کا ذکر بصیغۂ جمع متکلم ویمکن ان نحمل وغیرہ سے کریں تو اس سے ان کی مراد ذاتی تاویل ہوتی ہے۔

(۴)......**عند ابی یوسف، عند محمد** تو اس سے مراد ان حضرات ائمہ کا مسلک ہوتا ہے، جب کہ **عن ابی حنیفة، عن ابی یوسف** سے مراد ان ائمہ کی کوئی ایک روایت ہوتی ہے۔

(۵)......بعض اوقات کسی بحث کے اختتام پر ''**واللہ اعلم**'' لکھ دیتے ہیں، تو اس سے عموماً اس قول یا روایت کی کمزوری وضعف کی جانب، یا اس کے بارے میں عدم تیقن کا اشارہ مقصود ہوتا ہے، اسی طرح جس قول کو آپ **قیل** کے ساتھ ذکر فرمائیں اس سے بھی اس قول کا ضعیف ہونا مراد لیا جاتا ہے۔

(۵)......**کتابوں کی اصطلاح:** ''**الاصل**'' اس سے عموماً امام محمد الشیبانیؒ کی **المبسوط** مراد ہوتی ہے۔ ''**ظاهر الروایه**'' اس سے امام محمد کی چھ کتب (**المبسوط، الزیادات، الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، السیر الصغیر** اور **السیر الکبیر**) مراد ہوتی ہیں۔ ''**النوادر**'' اس سے حسب ذیل چار کتابیں مراد ہیں: (۱): رقیات۔ (۲): کیسانیات۔ (۳): ہارونیات۔ (۴): الجرجانیات۔ ''**الآثار**'' امام محمد کی **کتاب الآثار** مراد ہے۔ ''**المختصر**'' اس سے مراد درحقیقت **مختصر القدوری** ہے، البتہ بعض جگہ علامہ کاسانی نے امام طحاوی کی **المختصر** اور اس کی **شرح الاسبیحابی** کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ''**فتاویٰ**'' اس سے خصوصیت کے ساتھ کسی کتاب کی تعیین نہیں ہوسکی۔ البتہ سیاق وسباق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فتاویٰ مختلف ائمہ کے اقوال پر مشتمل تھا۔[1] (بقیہ آئندہ)

---

(۱) مترجم بدائع الصنائع جناب فرماتے ہیں: ''راقم الحروف کا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس سے مراد شاید صدر الکبیر الشہید حسام الدین عمر بن عبد العزیز (م ۵۳۶ھ) کا فتاویٰ الکبریٰ ہو، جس میں مختلف ائمہ وفقہاء بالخصوص سمرقندی فقہا کے فتاویٰ کو جمع کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

آداب واخلاق

پستی بھی کوئی پستی ہے

احسان الرحمٰن

حضرت ثابت بن قیس جلیل القدر صحابی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دیوانہ وار محبت کرتے تھے، سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں حاضری کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے کہ جب تک چہرہ انور دیکھ نہ لیتے قرار نہ آتا لیکن عجیب ہوا کہ ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم کی محفل میں آنا چھوڑ دیا، آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے ساتھی ثابت بن قیسؓ کی کمی محسوس کی اور ایک دن ان کے پڑوسی سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے استفسار کرنے لگے کہ ثابت کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ سعد بن معاذ رضی اللہ نے عرض کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وہ میرے پڑوسی ضرور ہیں مگر مجھے علم نہیں، میں ابھی جا کر معلوم کرتا ہوں۔ حضرت معاذؓ سیدھا اپنے پڑوسی سے ملنے پہنچے، دیکھا تو ثابتؓ گوشہ نشین ہیں، چہرے پر افسردگی اور تاسف ہے، آنکھیں متورم ہیں، کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں، لفظ ساتھ نہیں دیتے اور رو پڑتے ہیں، سعدؓ پریشان ہو گئے، پوچھا ماجرا کیا ہے؟ یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ ثابتؓ کو ہمدردی کے دو بول ملے تو دل بھر آیا، بچوں کی طرح بلک پڑے اور خوب روئے، جب جی ہلکا ہوا تو گلوگیر آواز میں گویا ہوئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس سے آنے والے سے کہا! سعدؓ میرے سب اعمال ضائع ہو گئے۔ سعد نے کریدا تو کہنے لگے: تم جانتے ہو میری آواز بھاری اور بلند ہے، سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں بعض اوقات ایسا ہوا کہ غیر ارادی طور پر میری آواز رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم کی آواز سے بلند ہو گئی۔۔۔ پھر تاسف بھرے لہجے میں روتے ہوئے کہنے لگے: ”میرے سارے اعمال

ضائع ہو گئے" یہ ان دنوں کی بات ہے جب اللہ تبارک تعالیٰ کو اپنے محبوب کی مجلس میں بیٹھنے والے صحابہ کرامؓ میں سے بعض کی غیرارادی طور پر اونچی ہو جانے والی آوازیں پسند نہ آئیں اور رب العالمین نے سرزنش کرتے ہوئے سورہ الحجرات کی آیات نازل ہوئیں:

"اے ایمان والو! اپنی آواز کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبی کے ساتھ اونچی آواز سے بات کیا کرو، جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو"

ان آیات کا نزول تھا کہ ثابت بن قیسؓ ڈر کر گوشہ نشین ہو گئے، انہوں نے مارے شرمندگی کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں جانا ہی چھوڑ دیا کہ اگر گیا، کوئی بات کی تو فطری طور پر بلند آواز کی وجہ سے میں سورہ الحجرات کی وعید کا واجب نہ ہو جاؤں، وہ سخت پشیمان رہے کہ ماضی میں وہ اسی بلند آواز کے ساتھ بات کرتے رہے، یہ تو بے ادبی ہوگئی، وہ گوشہ نشین ہو گئے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی حالت کی خبر ہوئی اور انہوں نے انہیں جنت کی بشارت دے دی۔

یہ صلح حدیبیہ کا واقعہ دیکھئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جانثار ساتھیوں کے ساتھ کعبے کی طرف بڑھے کہ خانہ کعبہ کا طواف کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چودہ اور بعض روایات میں پندرہ سو صحابہ کرامؓ تھے، حدیبیہ کے مقام پر کفار سامنے آگئے، راستہ روک لیا، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہم لڑنے نہیں بلکہ عمرہ کرنے آئے ہیں، بات چیت کا آغاز ہوا، کفار کی جانب سے عروہ بن مقصود ثقفی گفتگو کے لئے آئے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بات کرتے کرتے اپنی عادت کے مطابق سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی داڑھی کو ہاتھ لگانے کی کوشش کرتا اور قریب کھڑے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ فوراً حرکت میں آتے اور اس کے ہاتھ پر تلوار کا دستہ مار کر خبردار کرتے کہ ہاتھ پیچھے رکھ! تم کسی عام شخص سے نہیں، سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو۔ یہی عروہ جب واپس پہنچا تو اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: میری قوم کے لوگو! میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی جیسے بادشاہوں کے پاس گیا ہوں، بخدا میں نے کسی بادشاہ کی ایسی تعظیم نہیں دیکھی جتنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی ان کی کرتے ہیں۔ خدا کی قسم وہ تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لعاب دہن بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے۔ آپ کا لعاب دہن بھی ان میں سے کسی نہ کسی آدمی کے

ہاتھ پر پڑتا ہے"۔ یہ تو صحابہ کی بات ہے بعد میں بھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام کے حوالے سے مسلمان اسی طرح محتاط رہے۔

ایک بار امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے دروازے پر بہترین نسل کے خراسانی اور مصری خچر بندھے دیکھے، انہوں نے خچروں کی تعریف کی اور کہا کہ کیسے اچھے خچر ہیں۔ امام مالکؒ نے اسی وقت سب خچر انہیں ہدیہ کر دیئے، امام شافعیؒ نے کہا کہ ان میں سے کچھ تو اپنی سواری کے لئے رکھ لیں۔ جواب میں امام مالکؒ نے دھیمے لہجے میں کہا: مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ اس زمین کو جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اپنے گھوڑے کے سموں سے پامال کروں۔

آج میرے سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حرم میں ہم پاکستانیوں نے ادب کا سارا قرینہ بھلا دیا۔ سیاسی مخالفت میں ایسے اندھے ہو گئے کہ گنبد خضراء چند گز کے فاصلے پر ہوتے ہوئے بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا، بھول گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریب ہی آرام فرما ہیں۔

ستائیسویں شب کو حرم نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حکومتی وفد کے ساتھ جو کچھ ہوا اس پر دکھ احتجاج کا نہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ احتجاج کہاں کیا گیا، سیاست کے لیے دنیا پڑی ہے، احتجاج سیاسی جماعتوں کا حق ہے اور میں ان کے اس حق کے ساتھ کھڑا ہوں لیکن ظالمو! حرم نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو چھوڑ دیتے، یہاں آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مہمان ہو، کسی کے گھر میں بھی جا کر یوں ادھم نہیں مچایا جاتا، یہ تو پھر محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گھر ہے، ان کی آخری آرام گاہ ہے، یہاں تو نظر بھی نہیں اٹھتی، آوازیں کیسے اٹھیں "جھکاؤ نظریں بچھاؤ پلکیں ادب کا اعلیٰ مقام آیا"، عقل کام نہیں کر رہی کہ اس سیاسی تربیت کا اظہار کیوں ضروری ہوا، دنیا کو لازمی دکھانا تھا کہ ہم بلند آواز والے کتنے پست لوگ ہیں۔

افسوس اے عاقبت نااندیشو! کاش مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احساس کیا ہوتا، تم نے چیختے چلاتے پھبتیاں کستے ہوئے یہ مناظر اپنے سیل فون کے کیمروں سے محفوظ تو کر لیے، اب سورہ حجرات کی آیات کے تناظر میں اپنا مقام بھی دیکھ لو!

☆......☆......☆

یادگارِ زمانہ

حضرت قاری شمیم احمد۔۔۔ یادوں کے نقوش

مولانا اشتیاق احمد قاسمی
استاذ دارالعلوم دیوبند

ریاض العلوم میں چرنے کا موقع ملا، اس کے مَرغ زاروں میں مشام جان کو تازگی نصیب ہوئی، اس کے بوقلموں، پھولوں اور کلیوں سے نگاہِ دل شاد کام ہوئے، الحمدللہ اس کے شیریں چشموں سے جرعہ کشی کی توفیق، قرآن کریم کے عشاق کی تلاوت کا نظارہ، صالحین کی کہکشاں اور اس کی کرنوں کی جگمگاہٹ، فرشتہ صفت نفوس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا اور عبقریات سے استفادہ، زہے نصیب! اس پر جتنا شکر ادا کروں، کم ہے۔ داخلہ ہوا، ہر طرف اجنبیت، ماحول کو سمجھنے میں ابتدائی ایام گزر گئے، اساتذہ سے مناسبت ہوتے ہوتے ہوئی، ہر ایک سے عمومی تو چند سے خصوصی مناسبت ہوگئی۔

ان میں سرفہرست میرے مشفق ومحترم استاذ گرامی حضرت مولانا قاری شمیم احمد مدظلہ العالی ہیں، چہرہ ہنس مکھ، رخسار کتابی، پیشانی روشن، ناک چمکتی، آنکھیں قدرے کشادہ، ٹوپی دو پلی، داڑھی گھنی اور ہر طرف سے ایک مشت، مونچھیں پست، قد میانہ، بدن گھٹا ہوا، کرتا گھٹنے سے نیچے، سردی میں شیروانی، لنگی ٹخنے سے اونچی، پیر میں چپل اور کبھی جوتا اور وہ بھی سستا والا، سواری کے لیے سائیکل، دیکھیے یہی میرے سرتاج، مربی جن کی صحبتوں نے بہت سے لوہے کو کُندن بنا دیا، جن کی زندگی میں سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور طریقۂ صالحین کو پا کر بہت سے بگڑے ہوئے سنور گئے، صورت سے زیادہ سیرت کی طرف متوجہ رہتے اور متوجہ کرتے ہیں، اپنے ظاہری سراپا کو بنانے سنوارنے کا واہمہ بھی ان کو نہ ہوا ہوگا، حالانکہ قاری صاحب ہیں اور وہ بھی نہایت اعلیٰ ترین ادائیگی والے، آواز نہایت پرسوز،

پر کشش اور دل پذیر ہے۔ تجوید وقر آت کے اصول اور ان کی تطبیقات سب مستحضر، پھر بھی سادگی اور نہایت سادگی، الحمدللہ ماشاء اللہ!۔۔۔اور طلبہ کو صاف کہتے رہتے ہیں کہ

”بھائی میری عربی کی استعداد بہت کمزور ہے، ابّا کی شفقت، توجہ، دعائے سحر گاہی اور حضرت مولانا عبدالحلیم صاحبؒ کی نصیحت کی وجہ سے مولویت کی سند مل گئی، حضرت نے فرمایا: ”شمیم! میں چاہتا ہوں کہ تم بس اتنا کرلو کہ حدیث شریف کے الفاظ تمہارے سامنے سے گزر جائیں۔“ بس میں مان گیا اور مشکوۃ المصابیح پڑھ کر مظاہر علوم گیا اور فارغ ہوکر آ گیا، حضرت کا احسان کہ اس بے صلاحیت کو مادر علمی مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں، جون پور میں حفظ کا مدرس بنالیا، پھر دو سال بعد جب وہاں سے مدرسہ، ریاض العلوم کے نام سے گورینی منتقل ہوا تو میں بھی یہاں آ گیا، پھر حفظ سے ”مدرس تجوید“ بنا دیا گیا، آتا جاتا تو کچھ ہے نہیں بس کسی طرح کام چل جاتا ہے، اللہ قبول کرلیں تو بیڑا پار ہے، ورنہ اعمال تو ایسے ہیں نہیں جو اس بے نیاز پروردگار کی بارگاہ میں پیش کیے جانے کے لائق ہوں!“

پہلے سراپا راقم الحروف نے سر کی آنکھوں سے دیکھ کر لکھا، پھر حضرت کی زبانی (اپنے الفاظ میں) سیرت اور معنویت کو ذکر کیا اب آیئے! کچھ مشاہدات قلم بند ہوتے ہیں جو دیکھے اور برتے ہوئے ہیں، سنے ہوئے نہیں اور نہ ”پیراں نمی پرند مریداں می پرانند“ کا مصداق، حد اعتدال میں رہتے ہوئے بیان کی کوشش ہے، اگر کہیں کمی بیشی ہوجائے تو اسے معاف کیجیے اور نفس وشیطان کی شرارت سمجھیے اور صحیح ہو تو لطف لیجیے!

میں نے دیکھا کہ ان میں نہ آن بان شان ہے، نہ تکلف نہ بناوٹ، چند اسباق کے بعد ہی اپنے اوپر شفقتوں، عنایتوں اور کرم فرمائیوں کو محسوس کرنے لگا، سب سے پہلے جو کشش اُن کی طرف بے تحاشا کھینچنے لگی، وہ ان کی تلاوت تھی، ”ترتیل“ سے پڑھنے کی مشق کا سلسلہ شروع ہوا، ان کے پڑھنے کا انداز عام قاریوں سے بہت مختلف تھا، پڑھتے ہوئے نہ تو منھ بناتے، نہ پیشانی پر سلوٹیں آتیں، نہ ہاتھ میں حرکت ہوتی، نہ بدن کی ہیئت بدلتی، نہ لباس و پوشاک کی نستعلیقیت، نہ کسی اور طرح کی کوئی بناوٹ ہوتی، مگر آیات کے مضمون کا اثر جو قلب پر ہوتا، اُسے چہرہ چھپا نہ پاتا تھا، جنت

کے ذکر پر فرطِ مسرت سے طلب میں خوشی کے آثار اور شہنشاہ کی بارگاہ میں گدائے بے نوا کی کیفیت نظر آتی اور جہنم کے ذکر پر چہرہ زرد، آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتیں، بعض اوقات آنسو نکلنے لگتے، چھپانے کی کوشش کرتے مگر وہ اس پر قادر نہ تھے، معانی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا کر قراءت کرنے والے علماء سے میری ملاقات نہ ہوئی تھی، اور ”انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء“ کا نمونہ نہ دیکھا تھا، ہاں! قراء سے ملا تھا، مخارجِ حروف اور ان کی صفاتِ لازمہ و عارضہ کی رعایت کے ساتھ تیر بہدف صحیح قرأتیں ضرور سنی تھی، سنا تھا کہ خیر القرون میں قراء علما ہوتے تھے، اس کا مطلب قاری صاحب کو دیکھنے کے بعد سمجھ میں آیا، ایک بار سورہ فرقان کی آیات پڑھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، چہرہ متغیر، آنسو جاری، داڑھی تر! جب اس آیت پر پہنچے:

”والذین یقولون ربنا اصرف عنا عذاب جهنم ان عذابها کان غراما انها ساءت مستقرا ومقاما“

تو کیفیت دیدنی تھی، یہاں پہنچ کر تو سخت دل طلبہ بھی آبدیدہ ہوگئے، ”از دل خیز بر دل ریز“ کا محاورہ بھی وہیں سمجھ میں آیا، حضرت کے دل کی کیفیت لازم نہیں متعدی ہو کر رہتی تھی، تب سے طے کر لیا کہ اب قرآن بغیر سمجھے نہیں پڑھوں گا، ”حدر“ کی مشق کرتے ہوئے اس کی طرف توجہ ہوئی، کبھی سبق سنتے ہوئے کہتے: یہاں سے ترجمہ کرو! جب صحیح ترجمہ کر دیتا تو خوش ہوتے، بعد میں مقصد سمجھ میں آیا کہ قرآن کی تلاوت سمجھ کر کرنے کی طرف توجہ دلانا مقصد ہے۔

طلباء کو باطن باطن کہہ دیا کرو: کبھی حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادی کا ایک قیمتی ارشاد سناتے جو انہوں نے الہ آباد میں ایک مدرس مولانا محمد یوسف بستویؒ سے فرمایا تھا کہ باطن سے بے رغبتی عام ہے، علماء ظاہری علوم پر قناعت کرنے لگے ہیں، اس لیے اگر طلبہ کو پورے باطنی علوم نہ سکھا سکو تو کم سے کم درس گاہ میں ”باطن باطن“ کہہ دیا کرو! تاکہ طلبہ سوچیں کہ یہ کون سی بلا ہے؟ اور کس چڑیے کا نام ہے؟ حضرت قاری صاحب کی شخصیت کی چھاپ ہر شاگرد پر رہتی ہے، جس طرح علم تجوید وقرأت میں انہیں کمال حاصل ہو جاتا ہے، اسی طرح باطنی علوم اور احسان وسلوک سے بھی کافی مناسبت ہو

جاتی ہے، بزرگوں کا ادب واحترام قلب وجگر میں جاگزیں ہوجاتا ہے، اعمال میں وزن پیدا ہونے کے اسباب کی تلاش میں جی لگنے لگتا ہے اور کسی اللہ والے کی ہم نشینی اور ان سے تعلق پھر نسبت حاصل کرنے کا جی چاہتا ہے، یہی وہ قیمتی سرمایہ ہے جس سے اب درس گاہیں خالی ہیں، اگرچہ علوم شرعیہ میں بھی گراوٹ افسوس ناک حد تک ہے مگر طریقت اور معرفت کا بالکل فقدان ہے۔

سادگی کی نصیحت: ایک دن درس گاہ میں حاضر ہوا بال قدرے بڑے بڑے کنگھا کے لائق تھے، نہائے دھوئے تیل لگائے، اچھی ٹوپی اور نیا کپڑا پہنے ہوئے تھا، حضرت قاری صاحب نے محسوس کیا کہ بچہ ہے، زینت و جمال کی طرف جا رہا ہے، اس کے باطن کا تو کباڑ ہوجائے گا، چنانچہ نصیحت فرمائی: بھائی اللہ تعالیٰ انسان کی صورتوں کو نہیں دیکھتے اور نہ مالوں کو دیکھتے ہیں بلکہ دلوں کو اور اعمال کو دیکھتے ہیں (مسلم) اس لیے ظاہر سے زیادہ باطن کو بنانے کی کوشش ہونی چاہئے! پھر آپ نے "مظاہر علوم" کا اپنا ایک قصہ سنایا کہ

> "میں بڑے اچھے کپڑے پہننے کا عادی تھا، بڑی پُرکشش شیروانی پہنتا تھا لیکن میری عادت اوّابین پڑھنے کی تھی، اس میں تھوڑا قرآن پڑھتا تھا، مسجد مظاہر علوم میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ بھی مغرب بعد کے معمولات میں مصروف رہتے تھے اور مجھے برابر دیکھتے تھے، ایک دن اوّابین کے بعد مجھے بلایا، میں خدمت میں حاضر ہوا تو ظاہری لباس کی بات شروع ہوئی تو میں نے فوراً ہی موقع پا کر اپنا مرض بتادیا کہ "حضرت! میرا جی چاہتا ہے کہ میں اچھا اچھا لباس پہنوں" اتنا سنتے ہی حضرت نے آہ بھری اور اپنی ایک ہتھیلی دوسری پر رکھ کر ملنے لگے اور بہت افسوس کے عالم میں کچھ کہتے بھی جا رہے تھے، مفہوم یہ تھا کہ "افسوس ناک بات ہے اور یہ بڑی خراب خواہش ہے" ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے حضرت شیخ میرے قلب کو اپنی ہتھیلی میں لے کر مسل رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ زینت وزیبائش کی خواہش مرچکی ہے، الحمدللہ! اس کے بعد سے زیبائش کی کبھی تمنا نہ ہوئی۔"

اس واقعہ کے سننے کے بعد راقم الحروف سے بھی زیب وزینت کی طلب رفو چکر ہوگئی، لباس کے بارے میں بس یہی تمنا رہتی ہے کہ خلافِ سنّت نہ ہو اور گرمی سردی کے مضر اثرات سے حفاظت ہو جائے اور بس!

ریاض العلوم میں میری تجوید: میں اُمّی تھا کہ اَماں سے قرآن پڑھا تھا، مکتب میں ماسٹر عالمگیر صاحب تجوید سے واقف نہ تھے، اوراس پر مستزاد کہ بہار کے پس ماندہ دینی علوم سے اور علاقے کا تھا، اس سے قارئین سمجھ سکتے ہیں کہ میں کتنا بے کار پڑھتا ہوں گا، ہاں اول عربی سے سوم عربی تک اعظم گڑھ میں پڑھا تھا، اس لیے ساتھیوں اور اساتذہ کی ادائیگی کو سن سن کر اور روزانہ فجر بعد تلاوت کر کے ترجمہ قرآن کا کچھ حصہ پڑھنے کی وجہ سے قدرے درستگی آئی تھی، مگر صرف اتنی کہ ادائیگی کا بھونڈا پن ختم سا ہو گیا تھا، مخارج اور صفات اور دیگر تفصیلات سے ناواقف تھا، وہاں تلاوت کرتا یا عبارت پڑھتا تو ساتھی مسکرانے لگتے، اس احساس کی وجہ سے قاری صاحب اور تجوید وقرأت کی قدر میرے دل میں بہت زیادہ ہوگئی، اپنے سینئر ساتھی مولوی ابوطلحہ بیگوسرائے سے "مظہر التجوید" مؤلفہ قاری محمد اسماعیل مدظلہ العالی پڑھنے لگا، اور قرآن پڑھ کر روزانہ سنانے لگا اور قاری صاحب کے سبق میں پابندی سے حاضر ہوتا، کتاب یاد کرتا اور ترتیل سے مشق کرائی گئی، آیتوں کو خوب یاد کر کے قاری صاحب کی ادائیگی پر غور کر کے قرآن کی تصحیح کی طرف متوجہ تھا، چند دنوں بعد "حدر" میں قرآن سنانے کی تلقین ہوئی اور حضرت قاری صاحب نے ایک جیبی سائز سے قدرے بڑا قرآن پاک عنایت فرمایا کہ اس میں پڑھا کرو، اب میں اُسے ساتھ میں رکھتا اور قواعد التجوید کا (غیر رسمی) اجراء کرتا رہتا، مغرب کی نماز کے بعد جب درس گاہ میں بیٹھتا تو ساتھیوں کے معمول کو دیکھ کر میں نے بھی معمول بنایا کہ پہلے ترتیل کا سبق پڑھتا پھر درسی کتابوں کے مذاکرے میں لگتا، اور ایک چیز بڑی اچھی لگی تھی کہ وہاں اکثر طلبہ وقت ضائع نہیں کرتے تھے، جیسے بجلی گئی اور جنریٹر کی روشنی آنے کا انتظار ہوا تو اس وقفے کو غنیمت جان کر طلبہ قرآن کی مشق کرنے لگتے، ہر طرف سے اعوذ باللہ، بسم اللہ کی آوازیں بلند ہو جاتیں، قرآن پاک کی محنتوں کی نورانیت جو وہاں دیکھنے کو ملی، کہیں اور نہ ملیں۔ "حدر" کی مشق کے لیے فجر بعد سے اشراق تک کا وقت متعین تھا۔ اساتذہ کی نگرانی میں طلبہ تلاوت میں لگے رہتے، پھر مرحومین کے لیے دعا ہوتی اور اشراق پڑھ کر جاتے۔

قاری صاحب کا سبق: تجوید کی کتاب (مظہر التجوید، جمال القرآن، فوائدِ مکیہ) عموماً الگ سے

یاد نہ کی جاتی تھی، بس سبق کے لیے جانے سے پہلے عربی کی درس گاہ سے نکلتے وقت سارے ساتھی جلدی جلدی دیکھتے اور ڈیڑھ سو قدم کی مسافت میں کتاب سب کے ہاتھوں میں رہتی، درس گاہ میں بیٹھتے تو عموماً دبنگ ساتھی کنارے بیٹھے نحیف جسم ساتھی کی طرف اشارہ کرتے کہ "سنا"! "جلدی سنا"! اور قاری صاحب سے آنکھ بچا کر مکّا بناتے اور آنکھ دکھاتے۔ میں بھی انہیں کمزوروں میں تھا، اس لیے بھی وقت نکال کر یاد کرتا اور آتے ہی پہلے سناتا، اس میں علمی فائدہ بھی تھا اور یہی بچاؤ کا واحد ذریعہ بھی۔ پھر دوسری طرف سننے کا سلسلہ پہنچتا تو کچا پکّا سنانے کے لائق ہو ہی جاتا اور بعض ساتھی تپائی کے نیچے کتاب میں جھانک جھانک سنانے کی تدبیر بھی کرتے!

قاری صاحب کا جلال: اللہ رحم کرے جب ہماری کوتاہیوں کو برداشت کرتے کرتے قاری صاحب اُدب جاتے اور چہرہ سرخ ہونے لگتا اور ڈانٹنے لگتے، اس وقت آنکھیں بڑی خوفناک دکھتی تھیں، پھر تھوڑی دیر کے بعد ہی کھڑے ہوتے اور کونے میں رکھی ہوئی لاٹھی اٹھاتے، اتنے میں ہم لوگ نکل کر بھاگتے، آگے آگے ہم لوگ نو دو گیارہ اور پیچھے پیچھے قاری صاحب اور اُن کی تیز آواز! ایسا سال میں دو تین مرتبہ ضرور ہوتا، داخلے کے بعد ہی پُرنیوں نے بتا دیا تھا کہ حضرت قاری صاحب کی ہدایت ہے کہ جب میں غصّہ ہونے لگوں تو تم لوگ بھاگ جایا کرو ورنہ پٹائی کی حد نہ رہے گی، اس میں بڑی مصلحت اور شفقت پنہا تھی، جسے ہر غور کرنے والا سمجھ سکتا ہے۔

اندازِ تدریس: سبق پڑھانے میں بڑی مہارت دکھی کہ عبارت پڑھتے یا پڑھنے کا کہتے پھر ہر مشکل کو سادے انداز میں حل کرتے، ہر پوشیدگی کو کھولتے، اشکال اگر ہو رہا ہو تو جواب دیتے، اور طالب علم کا سوال سنجیدگی سے سنتے اور جواب دیتے اور اگر قابلِ مطالعہ یا مشکل ہوتا تو اپنے استاذِ محترم حضرت قاری محمد اسماعیل صاحب مدظلہ جو بازو والے کمرے میں پڑھاتے تھے بلاتکلف جاتے اور پوچھ کر مطمئن ہو کر ہمیں بتاتے اور سوال کے نقص کو بھی سمجھاتے، اس بے نفسی نے بھی ہمیں بہت متأثر کیا، درمیان میں بزرگوں کی باتیں، صالحین کے واقعات، صوفیہ کی باصفا تحقیقات بتا کر خود لذت لیتے اور ہمیں بھی محظوظ کرتے اور پہلوانوں کے قصوں سے بھی دلچسپی دیکھی، اسے بھی خوب مست ہو کر

سناتے، مزاحیہ باتوں سے خوب لطف لیتے اتنا کہ طالب علم اُن کو اپنا دوست سمجھ لیتا۔

نابینا کا سائیکل چلانا: ایک نابینا حافظ صاحب حضرت سے ملنے آتے تھے، منڈیار، اعظم گڑھ کے تھے، ان کا نام تھا: عبدالعلیم، وہ بڑے ذہین اور بزرگوں کے قدردان تھے، حضرت تھانویؒ کے مداح بھی، ان کا تعارف کراتے ہوئے سنایا کہ یہ حافظ صاحب دیکھنے میں نابینا ہیں، مگر بہت سے کام آنکھ والوں جیسے کرتے ہیں، پھر فرمایا کہ سائیکل بھی چلاتے ہیں، ایک بار انھوں نے مجھے بتایا کہ میں سائیکل بھی چلاتا ہوں تو میں نے کہا کیسے؟ تو کہا کہ آپ آگے آگے لاٹھی کھٹکھٹاتے چلیں میں اس آواز پر سائیکل چلاتا ہوں فرمایا کہ میں نے ان کی لاٹھی لی اور آگے آگے کھٹکھٹاتے ہوئے چلا تو میں جدھر کھٹکھٹاتا وہ اسی طرف کو رواں ہو جاتے، میں آگے اور وہ پیچھے، کئی بار تو ایسا لگا کہ میرے اوپر چڑھا دیں گے، جب میں چلّایا تو دونوں بریک کو ایک ساتھ انھوں نے ایسا دبایا کہ توڑ ہی دیا اور ایک انچ بھی نہ بڑھے، یہ بول کر قاری صاحب خوب ہنسے اور ہنسایا۔

کھانا اور قیلولہ قربان: میں چہارم میں داخل ہوا، پنجم عربی پڑھ کر میرے ساتھی دارالعلوم دیوبند آگئے لیکن میں نے سوچا کہ ایک سال اور پڑھ لوں یعنی ’’مشکوٰۃ‘‘ پڑھ کر جاؤں گا، اس لیے کہ وہاں **جلالین شریف**، **مشکوٰۃ** کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے، تفسیر قرآن کریم کو چھوڑ کر آنا گوارا نہ ہوا، اِدھر میرے اندر یہ کمی تھی کہ ’’قرأت سبعہ‘‘ میں نے پڑھی نہیں تھی اور سنا تھا اور تجربہ بھی ہوا کہ علم تجوید اور سبعہ کے بغیر تفسیر میں تشنگی رہتی ہے، چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ **جلالین** جیسی کتاب کو باضابطہ نہ پڑھنا مجھے گوارا نہیں، اس لیے کہ قرآن وسنت کے لیے ہی تو ہم نے نحو، صرف، بلاغت اور عربی زبان کو کئی سال پڑھا ہے، اگر مقصد ہی میں کمزوری رہ گئی تو دیوبند کی سند جچے گی نہیں، چنانچہ میں نے حضرت قاری صاحب سے عرض کیا کہ میں سبعہ پڑھنا چاہتا ہوں، آپ مجھے پڑھا دیں! فرمایا ٹھیک ہے، بتاؤ کس وقت پڑھو گے؟ میں نے کہا آپ جب کہیں گے میں اسی وقت پڑھوں گا، فرمایا: دوپہر میں پڑھ لیا کرو، چنانچہ عربی کے گھنٹے کے بعد میں درس گاہ پہنچ جاتا اور ’’**شاطبیہ**‘‘ پڑھتا۔ پھر اجراء شروع ہوا تھا تو ساتوں قراء اور ان کے چودہ شاگردوں کے نام اور

"ابجدی" انداز میں اُن کے رموز یاد کیے، پھر قاری صاحب نے اپنا قرآنِ پاک عنایت فرمایا جس میں اجراء لکھا ہوا تھا، پورے قرآن پاک کا اجراء اس سے نقل کیا، اس کے لیے جمعہ کا دن خاص تھا، فجر بعد سے نمازِ جمعہ تک اسی میں لگا رہتا، عموماً جمعہ کے دن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (تا کھا، اعظم گڑھ سے) آتے اور مجھے قرآن پاک میں لگا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوتے، مگر پوچھتے قرآن میں کیوں لکھتے ہو؟ میں بتاتا کہ قراءت سبعہ کو لکھے بغیر پڑھنا مشکل ہے، اس پر خاموش ہوجاتے، مگر پھر اگلے جمعہ یہی سوال کرتے اور کہتے: مجھے قرآن میں لکھتے ہوئے دیکھ کر بے ادبی کا احساس ہوتا ہے، لیکن چلو قاری صاحب کہتے ہیں تو ٹھیک ہے، پھر قاری صاحب سے ملاقات کرتے اور خوب باتیں کرتے، ابّا کی ملاقات کے بعد قاری صاحب مجھے اور بھی ماننے لگے۔

غرض یہ کہ پورے سال حضرت قاری صاحب نے دوپہر کا کھانا چھوڑ دیا کہ کھانے کی وجہ سے سستی پیدا ہوگی، قیلولہ کرنا پڑے گا اور اشتیاق کے سبق کا ناغہ ہوجائے گا، میں بھی ناغہ نہ کرتا، قدر دانی کے ساتھ پڑھتا رہا، سات پارے تک اجراء کے ساتھ پڑھ سکا، پھر اس کا امتحان بھی دلوایا اور الحمداللہ امتیازی حیثیت سے کامیابی کی سند نصیب ہوئی۔

اذکار و اوراد: حضرت قاری صاحب اذکار اور معمولات کے پابند تھے، اگر کبھی فجر سے پہلے ذکر (قدرے جہری) نہ کر پاتے تو دیکھتا کہ ظہر کی سنت و نفل کے بعد مسجد میں دوسری صف میں داہنی طرف بیٹھ کر اسے پورا کر لیتے تھے، ہم لوگ اگرچہ باضابطہ بیعت نہ تھے، مگر حضرت کی سرپرستی نے باطن کی طرف متوجہ کردیا تھا۔

اسباق میں اشعار: مولائے روم کی مثنوی اور خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کے اشعار خوب سناتے تھے۔

(الف)......: ایک بات نصیحت فرما رہے تھے کہ اکابر کی ناراضگی سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے، اساتذہ ناراض ہوتے ہیں صرف ظاہر میں! اندر سے وہ شفیق ہوتے ہیں اور کبھی دیکھتے رہتے ہیں کہ چہرے پر کیا اثر مرتب ہو رہا ہے؟ کیا اندر سے اصلاح ہوگئی ہے یا ابھی اور رگڑنا ہے؟ اچھا مرید

وہ ہوتا ہے جو شیخ کو نہیں چھوڑتا، پھر سنایا کہ ایک بار حضرت تھانویؒ خواجہ صاحب سے ناراض ہو گئے، بھگا دیا اور دروازہ بند کرلیا، خواجہ صاحب بھی پکے تھے، دروازے کے باہر بیٹھ گئے اور گانے لگے:

اُدھر تم در نہ کھولے گئے اِدھر میں در نہ چھوڑوں گا

حکومت اپنی اپنی ہے، اُدھر تیری، اِدھر میری

(ب)......: ایک بار فرمایا کہ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؔ حضرت تھانویؒ کے عاشق تھے، اس کا مظہر "اشرف السوانح" ہے، اور فرمایا کہ خواجہ صاحب کے پاس حضرت کا ایک خط آیا تو بڑی مسرت ہوئی اور گویا ہوئے:

بڑی مدت پہ ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ

بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستور میخانہ

(ج)......: کبھی خواجہ صاحب کی غزل معرفت سناتے تھے:

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

ایک تم سے کیا محبت ہو گئی ساری دنیا سے عداوت ہو گئی

نگاہوں کی حفاظت کی نصیحت: نگاہوں کی حفاظت کی تلقین فرمائی کہ بدنگاہی آگ ہے، اس سے نیکیاں جل جاتی ہیں، پھر ایک پیر صاحب کے مرید کا واقعہ سنایا کہ مرید بدنگاہی کا عادی تھا، پیر صاحب کی ایک خادمہ تھی، اس کی طرف وہ گھورتا رہتا تھا، پیر نے اس خادمہ کو اسہال (دست) کی دوا دی، جب خوب دست آ گئے تو وہ بالکل نڈھال ہو گئی اور چہرے کی کشش جاتی رہی، اب جب وہ آئی تو اس کی طرف للچائی نظروں سے نہ دیکھا تو پیر صاحب نے اس مرید کو فرمایا کہ بیت الخلاء جا کر پاخانے کو دیکھ آؤ جو اس خادمہ نے پھرے ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ اب کیوں نہیں دیکھ رہے ہو؟ لڑکی تو وہی ہے، بس اس سے پاخانے نکلے ہیں، بقیہ تو ہے وہی، پھر فرمایا کہ اصل میں بدنگاہی پاخانے کی طرف ہی تھی، مگر وہ اندر ہونے کی وجہ سے چہرے کی کشش بنا ہوا تھا، اس پر مرید شرمندہ ہوا۔

(باقی آئندہ)

اردو ادب

سیّد صادق حسین کاظمی کی شعری جہات

ڈاکٹر محمود احمد کاوش (نارووال)

سیّد صادق حسین کاظمی یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء کو کشمیر کے ایک گاؤں کھادڑ پاڑا میں سادات کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد محمد شاہ محکمہ مال میں قانون گو کی حیثیت سے ملازمت کرتے تھے۔ وہ درویش مزاج انسان تھے۔ ۱۹۰۵ء میں سیّد صادق حسین کاظمی کو بارہ مولا کے مڈل اسکول میں داخل کرا دِیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں اِس خاندان نے کشمیر سے ہجرت کی اور ضلع سیال کوٹ کی تحصیل ظفر وال میں آن بسا۔ یہاں اسلامیہ پرائمری اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۷ء میں اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی گیٹ، لاہور سے میٹرک کے امتحان میں نمایاں حیثیت سے کام یابی حاصل کی۔ اس کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور سے جے۔ وی کا امتحان پاس کیا۔ یکم اپریل ۱۹۱۹ء کو جھنگ مگھیانہ میں تدریس کا آغاز کیا۔ اِسی دوران ایف۔ اے کا امتحان بھی پاس کیا۔ شکر گڑھ کے قریب مینگڑی میں غلام دین اسلامیہ ہائی اسکول تھا۔ چناں چہ ۱۹۲۳ء میں اِس اسکول سے وابستہ ہو گئے۔ اگلے سال ۱۹۲۴ء میں بی۔ اے کے امتحان میں کام یابی حاصل کی۔

سیّد صادق حسین کاظمی کے وکالت کی طرف آنے کا قصہ یوں ہے کہ جن دِنوں جھنگ مگھیانہ میں مدرس تھے، ایک تقریب میں ایک وکیل نے سیّد صادق حسین کاظمی کی گفت گو سن کر طنز آمیز انداز میں کہا کہ تم ہو تو اسکول ٹیچر مگر باتیں وکیلوں کی طرح کرتے ہو۔ بس اُسی وقت اُنھوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ

وکیل بن کے دِکھائیں گے۔ چناں چہ جب بی۔اے کا امتحان پاس کر لیا تو ایل۔ایل۔بی کی طرف آ گئے اور ۱۹۲۷ء میں لاہور سے وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔اس وقت ظفروال کا تحصیل کا درجہ ختم کر دِیا گیا تھا۔چھبیس کلومیٹر دُور ضلع گورداس پور کی تحصیل شکرگڑھ تھی۔اللہ کا نام لے کر یہاں وکالت شروع کی اور اِس شعبے میں بھی عزت ووقار کے ساتھ نام پیدا کیا۔

وکالت کا پیشہ اِختیار کرنے کے بعد سیّد صادق حسین کاظمی نے مقامی سیاست میں بھی کردار اَدا کرنا شروع کیا۔شکرگڑھ میں مسلم لیگ کے قیام کا سہرا اُن کے سر ہے۔ ۱۹۳۶ء میں وہ مقامی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ وہ چار سال تک اس منصب پر فائز رہے۔سیّد صادق حسین کاظمی نے پورے جوش وجذبے کے ساتھ تحریکِ آزادی میں حصہ لیا۔ پاکستان بننے کے بعد اُنھیں احساس ہوا کہ جن مقاصد کی خاطر عظیم قربانیاں دے کر یہ خطۂ ارض حاصل کیا گیا ہے، اُنھیں پسِ پشت ڈال دِیا گیا ہے تو ۱۹۵۱ء میں وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔

سیّد صادق حسین کاظمی کو اللہ کریم نے قابل اولاد سے نوازا۔اُن کے دو بیٹے سول سروس کا امتحان پاس کر کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔اُنھیں اپنی زندگی میں بہت سے صدمات بھی سہنا پڑے۔ اُنھیں اپنے بھائی سیّد ظہور شاہ کاظمی کی وفات کا بہت دُکھ تھا۔اُنھیں اپنے دو بیٹوں سیّد اکبر کاظمی اور سیّد آفتاب کاظمی کی وفات کے صدمات بھی جھیلنا پڑے۔ اُنھی دنوں میں اُن کی والدۂ محترمہ بھی رُخصت ہو گئیں۔ اِن پیہم صدمات کے باعث سیّد صادق حسین کاظمی دِل کے عارضے میں مبتلا ہو گئے۔سال ۱۴۰۹ ہجری کے رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کی ستائیسویں (۴ مئی ۱۹۸۹ء، بروز جمعرات) کو کاظمی صاحب اِس جہانِ فانی سے دارِ بقا کی طرف سدھار گئے۔اُنھیں اسلام آباد میں سپردِ خاک کیا گیا۔

سیّد صادق حسین کاظمی کو شعر گوئی سے شغف تھا لیکن اُنھوں نے اِس ملکہ سے بھرپور طریقے سے کام نہیں لیا۔اُن کا کلام اُس زمانے کے اخبارات اور رسائل کی زینت بنتا رہا لیکن اُنھوں نے کبھی اسے محفوظ کرنے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ ۱۹۷۶ء میں اُن کا مختصر سا مجموعۂ کلام بہ عنوان

''برگِ سبز'' فیروز سنز نے شائع کیا۔ اس کا دُوسرا ایڈیشن اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

اِس مجموعۂ کلام کا آغاز ''دُعائے مقبول'' سے ہوتا ہے۔ یہ سورۃ الفاتحہ کا منظوم ترجمہ ہے۔ راقم نے ۲۰۰۳ء کے قومی نصاب کے مطابق پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور کی جماعت ہفتم کی اُردُو کتاب مرتب کی تو اُس کے آغاز میں ''حمد'' کے طور پر یہی نظم شامل کی تھی۔ پانچ شعروں پر مشتمل یہ ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

خداوندِ جہاں تیرے لیے تعریف ہے ساری　　کہ ہے لطف و کرم تیرا ہر اِنس و جان پر جاری
ہے تو ہی مالک و مختارِ کل روزِ قیامت کا　　ہر اِک ہم میں سے دم بھرتا ہے تیری ہی عبادت کا
تری ہی ذات سے ہوتے ہیں ہم اِمداد کے طالب　　تو ہی ہے جو ہمیں لے جائے راہِ راست کی جانب
دِکھا رستہ ہمیں انعام و نعمت پانے والوں کا　　ہدایت پانے والوں کا، فضیلت پانے والوں کا
نہ اُن کی راہ جن پر ہو گیا تیرا غضب طاری　　کہ وہ گم راہ ہیں، اُن سے بچا لے ہم کو اے باری

سیّد صادق حسین کاظمی کی ایک نظم کا عنوان ہے ''صحرا کا نبی''۔ یہ ابوالاثر حفیظ جالندھری کے ''شاہ نامۂ اسلام'' کی زمین میں کہی گئی ہے۔ چوالیس اشعار پر مشتمل اِس نظم میں سیّد صادق حسین کاظمی نے اسلام کی تاریخ قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِس نظم سے وہ اشعار دیکھیے جن میں غارِ حرا میں وحیِ اوّلین کے نزول کا ذکر ہے:

یونہی وہ کر رہا تھا ایک دِن یادِ خدا وندی　　کہ آیا اِک فرشتہ لے کے اِرشادِ خدا وندی
سنا اُس نے نہایت غور سے جو کچھ کہا اُس نے　　کیا یہ ذکر آ کر پھر چچا سے اور بیوی سے
نبی ہونے کی دونوں نے اُسے فوراً بشارت دی　　بڑھایا حوصلہ اُس کا، تسلی دی، اعانت کی

اگر حفیظ کے ''شاہ نامۂ اسلام'' اور ''صحرا کا نبی'' کا موازنہ کیا جائے تو ''شاہ نامۂ اسلام'' شعری محاسن کے لحاظ سے بہتر ہے۔ اِس نظم میں دو مقامات پر کاظمی صاحب نے حفیظ کے مصرعے بھی استعمال کیے ہیں۔ پہلے حفیظ کے دو شعر دیکھیے جن میں مذکورہ دو مصرعے استعمال ہوئے ہیں اور اُس کے بعد کاظمی صاحب کے دو شعر درج کیے جاتے ہیں۔

کہا سرکارؐ اِن لوگوں کے حق میں بد دُعا کیجے
شکایت اِس جفا و جور کی پیشِ خدا کیجے
جناب رحمت للعالمینؐ نے ہنس کے فرمایا
کہ میں اِس دہر میں قہر وغضب بن کر نہیں آیا

کہا اصحاب نے اِن کافروں کو بد دُعا دیجے
''شکایت اِس جفا و جور کی پیشِ خدا کیجے''
رسولِ پاکؐ نے اُس وقت یہ اَرشاد فرمایا
''کہ میں اِس دہر میں قہر وغضب بن کر نہیں آیا''

جن دِنوں آزادی کی تحریک اپنے زوروں پر تھی، ہندوؤں اور سکھوں نے شکر گڑھ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایک جلوس نکالا۔ اِس جلوس میں تکرار کے ساتھ یہ شعر پڑھا جارہا تھا:

نغمۂ حُبِّ وطن سُولی پہ گایا جائے گا
موت کو بھی زندگی کر کے دِکھایا جائے گا

اِس کے جواب میں سیّد صادق حسین کاظمی نے ''نغمۂ اسلام'' کے عنوان کے تحت ایک نظم کہی۔ اِس نظم میں جوش اور جذبے کا ایک سمندر ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ آزادی کی تحریک کے زمانے میں مسلمانوں کو آزادی کی خاطر اپنا تن، من، دھن قربان کرنے کے عہد کی حامل یہ نظم چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اِس نظم میں اُنھوں نے ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں کو متنبہ کیا ہے۔ اِس نظم کا ہر شعر ایک للکار ہے۔ اِن اشعار میں وہی طنطنہ، وہی رعب اور وہی دبدبہ محسوس کیا جا سکتا ہے جو مولانا ظفر علی خان کی نظموں کا خاصّہ ہے۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں اس نظم کے اشعار کا تحریکِ آزادی کے متوالوں پر کیا اثر ہوا ہوگا!

نغمۂ اسلام زندہ باد گایا جائے گا
خوابِ غفلت سے مسلماں کو جگایا جائے گا

دیکھتی ہے خواب ہندو راج ہی کے کانگرس
خاک میں اِس کے اِرادوں کو ملایا جائے گا
سنگ دِل انگریز بھی سن لے یہ گوشِ ہوش سے
راہ میں پتھر جو آئے گا، ہٹایا جائے گا
باز آ جا اپنی ہٹ دھرمی سے اے بلدیو سنگھ!
ورنہ لاشوں پر ہی پاکستاں بنایا جائے گا

سیّد قاسم رضوی (۱۷ جولائی ۱۹۰۲ء۔۔۔ ۱۵ جنوری ۱۹۷۰ء) حیدرآباد (دکن) کے ایک عظیم سپوت تھے۔ وہ مجلسِ اتحادالمسلمین کے صدر تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ریاست حیدرآباد میں رضا کار ملیشیا کے بانی بھی تھے۔آپ ریاست حیدرآباد کے بھارت کے ساتھ اِلحاق کے شدید مخالف تھے۔ ''پولو'' نامی اپریشن کے دوران میں بھارتی فوج ریاست حیدرآباد پر چڑھ دوڑی۔اس کے نتیجے میں رضا کاروں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور جبراً ریاست کا اِلحاق بھارت سے کر دِیا گیا تو سیّد قاسم رضوی کو گھر میں نظر بند کر دِیا گیا۔ بعدازاں اِشتعال انگیز سرگرمیوں میں حصہ لینے اور فرقہ وارانہ تشدد کو ہوا دینے کے الزام میں اُن پر بھارتی قوانین کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ اُنھیں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۷ء تک پابندِ سلاسل رکھا گیا۔ بالآخر اِس شرط پر اُن کی رِہائی عمل میں آئی کہ وہ پاکستان ہجرت کر جائیں۔ چناں چہ سیّد قاسم رضوی کراچی چلے آئے، جہاں وہ ۱۹۷۰ء میں وفات پا گئے۔

سیّد قاسم رضوی کا مختصر تعارف دینے کا مقصد یہ تھا کہ سیّد صادق حسین کاظمی کی نظم ''شیرِ دکن'' کا پس منظر ذہن میں رہے۔ اِس نظم میں کاظمی صاحب نے سیّد قاسم رضوی کی ہمت وشجاعت کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا۔ سات اشعار پر مشتمل اِس نظم میں شاعر کے جذبات اپنے عروج پر نظر آتے ہیں:

بھیڑیوں کے غول میں شیرِ دکن محصور ہے
قاسمِ رضوی حصارِ ہمتِ مجبور ہے
لرزہ بر اندام اعدا ہیں تری تقریر سے
تو نے مُردوں کو جگایا نعرۂ تکبیر سے

کربلا میں سختیاں جھیلیں تیرے اجداد نے
تجھ پہ توڑے ہیں مظالم نہروِ شدّاد نے
کفر کا سیلاب خود سُوئے فنا بہ جائے گا
نام زندہ رہتی دُنیا تک ترا رہ جائے گا

جلیاں والا باغ کا سانحہ (۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء) برِصغیر پاک وہند کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جنرل ڈائر کے حکم پر نہتے شہریوں پر اندھا دُھند گولیوں کی بارش کی گئی۔ اس واقعے میں چارسو افراد کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا جب کہ پندرہ سو کے قریب زخمی ہوئے۔ اِس واقعے سے متأثر ہو کر شعرائے کرام نے نظمیں لکھیں۔ مولانا ظفر علی خان کی کئی نظمیں ''زمیندار'' میں شائع ہوئیں۔ سیّد صادق حسین کاظمی نے بھی ''حادثۂ جلیاں والا باغ کے موقع پر'' کے عنوان کے تحت ایک نظم لکھی۔ یہ نظم روزنامہ ''آفتاب'' میں شائع ہوئی۔ اِس نظم میں اُنھوں نے بے باکی سے کام لیتے ہوئے جنرل ڈائر کے فعل کو مجنونانہ قرار دیا۔ اُنھوں نے انگریز حکمرانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

آپ کی مرضی ہے اِس کو عقل پر مبنی کریں
میں سمجھتا ہوں کہ یہ اِک فعلِ مجنونانہ ہے
صاف کہتا ہوں کہ یہ ہے بزدِلی کا اِک نشاں
آپ کے نزدیک گو اندازِ بے باکانہ ہے

سیّد صادق حسین کاظمی نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی نظم بہ عنوان ''قائداعظم کے حضور میں'' اس عظیم راہ نما کی ولولہ انگیز قیادت کا ذکر کیا۔

رہے گا تا ابد اے قائدِ اعظم ترا چرچا
تری ہمت کے صدقے تو نے پاکستان بنوایا
تری حکمت کے آگے لرزہ بر اندام تھا گاندھی
زہے قسمت مسلمانوں کو لیڈر مل گیا تجھ سا

رہے آباد پاکستان تیرا رہتی دُنیا تک
قیامت تک رہے جاری جو فیضِ عام ہے تیرا

سیّد صادق حسین کاظمی کی اکثر نظمیں جوش اُبھارنے اور خون گرما دینے والی ہیں۔ وہ مسلمانوں کو جمود اَور بے عملی سے نکال کر میدانِ عمل میں سرگرم دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کی نظم ''خطاب بہ مسلم'' بھی اِسی نوعیت کی ایک نظم ہے۔ یہ نظم ''زمیندار'' میں شائع ہوئی تھی۔ ذیل میں اِس نظم سے چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

رہے گا تا بکے مسلم! بھلا تُو نیم جاں ہو کر
نہ کھا یوں ٹھوکریں دُنیا میں سنگِ آستاں ہو کر
اگر سودائے ہستی ہے تو گرمِ تازہ کوشی ہو
سمجھ لے موت سے بدتر ہے جینا بے نشاں ہو کر
متاعِ زندگی تاراج ہوتا ہے خدارا اُٹھ
زمانے بھر کو کر بے تاب سرگرمِ فغاں ہو کر

ایک اور مقام پر بھی سیّد صادق حسین کاظمی نے مصائب میں حیران و سرگرداں نہ ہونے کا پیغام دِیا ہے۔ وہ اغیار سے امداد کا طالب ہونے کے بجائے اپنی مدد آپ کا درس دیتے ہیں۔ وہ اخلاقِ عالیہ پر کاربند رہنے اور زِندگی میں کچھ کر گزرنے کی دعوت دیتے ہیں:

رفعتِ اخلاق لے جائے تجھے افلاک پر
خواہشاتِ نفس سے آلودہ گر داماں نہ ہو
زندگی تجھ کو ملی کچھ کر دِکھانے کے لیے
جنبشِ سیماب پیدا کر، تنِ بے جاں نہ ہو

سیّد صادق حسین کاظمی کو اپنی اہلیہ سے بے حد محبت تھی۔ جن دِنوں وہ بیمار تھیں تو کاظمی صاحب نے ''رفیقۂ حیات کے نام'' ایک نظم لکھی۔ اِس نظم میں اُنھوں نے اپنے دِلی جذبات کا اِظہار کیا ہے۔ اُنھوں نے مذکورہ نظم میں اپنی رفیقۂ حیات کے پاکیزہ کردار، اُن کی بے مثل رفاقت، قدم قدم پر حوصلہ

افزائی اور اَولاد کی تربیت کے حوالے سے اِظہارِ خیال کیا ہے:

مبارک ہے ترا نقشِ قدم اے فخرِ نسوانی!
ترے دم سے ہے ویرانہ بھی رشکِ صحنِ بستانی
سلامت ہے ترے نورِ تبسم کی ضیا اب تک
نہ اب تک مٹ سکی تیرے حسیں جلووں کی رعنائی
کسی فرعون کے آگے نہ گردن جھک سکی اپنی
ترے قربان! کی ہر گام پہ جو ہمت افزائی

سیّد صادق حسین کاظمی نے ایک نظم ''بسترِ علالت پر'' میں اپنے خاندان کے فوت ہو جانے والے افراد کو یاد کیا ہے۔ آگے چل کر اُنھوں نے نظم کو ایک موڑ دِیا ہے اور دُنیا میں غریبوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر کیا ہے۔ اُنھوں نے اللہ تعالیٰ سے اِن ستم رسیدوں کے لیے دُعا بھی کی ہے۔

غریبوں کی ناؤ ہے منجدھار میں
گھرے ہر طرف سے ہیں آزار میں
برستی ہیں ان پر سدا لاٹھیاں
میسر نہیں ان کو امن و اماں
یزیدی ابھی ہیں بہت زور میں
جو ہوتے ہیں ظاہر ہر اِک دَور میں
جلاتے ہیں اُن کے لیے آگ جو
ترے رحم سے اُن پہ گلزار ہو
تو ہی منتقم ہے جلا دے اُنھیں
چلا بادِ صرصر ، اُڑا دے اُنھیں

سیّد صادق حسین کاظمی کی ایک نظم ''لطفِ خلوت'' مکالماتی انداز پر مبنی ہے۔ اِس میں شاعر اور ایک درویشِ خدا مست کے مابین مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔ شاعر نے درویش سے استفسار کیا کہ وہ کس

لیے چاک گریباں رہتا ہے اور کس کی یاد میں اُس پر ہمہ وقت بے خودی طاری رہتی ہے۔شاعر نے درویش سے اِس خلوت سے کنارہ کشی کی درخواست کرتے ہوئے شہر میں تکیہ جمانے کی استدعا کی کہ جہاں دِل لگی کے ہزاروں سامان موجود ہیں۔

شاعر کی یہ گفت گو سننے کے بعد درویش جواب دیتا ہے۔یہ جواب کیا خوب ہے۔اِس جواب کے آخر میں ایک پیغام بھی موجود ہے۔ذیل میں درویش کا مکالمہ درج کیا جاتا ہے:

کہنے لگا اے بندۂ حرص و ہوا ہو دُور
اپنی نبیڑ، جا، تجھے غیروں کی کیا پڑی
دیوانہ ہے وہ ، خاک بسر جو کہے مجھے
تاجِ سکندری سے ہے بہتر برہنگی
ہم مر چکے ہیں موت کے آنے سے پیش تر
ہستی نثار جس پہ ہو ، یہ ہے وہ نیستی
اپنی نظر میں فرق نہیں سیم و خاک میں
یکساں ہے اپنے واسطے سب بیشی و کمی
دُنیا کے بند توڑ کر، خالق سے جوڑ کر
ہم ہو چکے ہیں وقفِ مناجاتِ ایزدی
انساں کو چاہیے کہ پریشاں کبھی نہ ہو
ہیں درد و رنج و راحت و آرام رفتنی
خلوت میں جو مزا ہے وہ جلوت میں ہے کہاں
جنگل میں شہر سے ہے زیادہ کہیں خوشی

مکالماتی انداز کی حامل ایک اور نظم کا عنوان ہے ''موت''۔ پہلے تین شعروں میں ایک سوال ہے جب کہ آخری دو شعر موت کی طرف سے جواب پر مبنی ہیں۔ پہلے تین شعروں میں موت کو دریائے

ہستی میں طوفاں خیز بتایا گیا ہے۔ وہ بلا انگیز بھی ہے۔ اُسے ماؤں سے بچوں کا چھیننا مرغوب ہے۔ گلشنِ ہستی موت کے ہاتھوں سے وقفِ خزاں ہے۔ یہ بہارِ بوستاں چند دِن کی مہمان ہے۔ اب موت کی طرف سے دِیا جانے والا جواب ملاحظہ کیجیے:

تھی کہیں نزدیک بولی سن کے ہو کر خشمگیں
میں تری ہستی کا ناداں خاتمہ کرتی نہیں
اِک نئ دُنیا کا تیرے واسطے پیغام ہوں
میں نویدِ صبح لاتی ہوں، اگرچہ شام ہوں

اگرچہ سیّد صادق حسین کاظمی کی نظموں میں منظر کشی کی زیادہ مثالیں نہیں ملتیں، لیکن جو چند ایک مقامات پر ایسی تصویر کشی ملتی ہے، اُس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کاظمی صاحب میں منظر کشی کا جوہر موجود تھا۔ اگر وہ اِس طرف آتے تو کمال کی تصویر کاری دیکھنے کو ملتی۔ مثال کے طور پر اُن کی چار اشعار پر مشتمل نظم ''صبح'' دیکھی جا سکتی ہے۔ اِس نظم میں سونے والوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اُٹھو! صبح کی آمد آمد ہے۔ آپ بھی دیکھیے صبح کس شان سے آ رہی ہے:

چاندی کا ایک دریا ہر سمت بہ رہا ہے
کس شوق سے وہ دیکھو اُس میں نہا رہی ہے
پہنے ہوئے ہے جوڑا وہ سرخ بادلوں کا
کیا بن سنور رہی ہے، جوبن دِکھا رہی ہے

سیّد صادق حسین کاظمی کی نظمیں ''اخبارِ تعلیم'' کی زینت بھی بنتی رہی ہیں۔ ''امتحان کا ہال'' اور ''سیاہ فام'' ایسی ہی نظمیں ہیں۔ ''سیاہ فام'' ایک ایسے طالب علم کی حمایت میں لکھی گئ نظم ہے جس کی رنگت سیاہ ہے مگر لیاقت کے اعتبار سے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اِس نظم کے آغاز میں سیاہ فام طالب علم اپنی سیاہ رنگ کا سبب بیان کر رہا ہے۔ لیجیے آپ بھی اس سبب سے آشنا ہو جائیں:

رنگ کی دولت ازل میں جس گھڑی تھی بٹ رہی
دُھن مجھے تب تھی ذہانت اور لیاقت کی لگی

لُوٹ کر جب اِن کو میں آیا تو باقی کچھ نہ تھا
ہو چکی تھی ختم سب سرخی، سفیدی، گندمی
مجھ کو جب دیکھا فرشتوں نے تو جھٹ کہنے لگے
حیف تیرے واسطے ہے اِک گھٹا کالی بچی
ہنس کے میں بولا کہ کچھ پروا نہیں دیجے مجھے
اِس اندھیرے میں بھی میرے واسطے ہے روشنی
جسم گو ہو گا شبِ تاریک سے تاریک تر
دِل میں نورِ علم کی ہوگی مگر جلوہ گری
اچھی سیرت کی مجھے پروا ہے صورت ہو نہ ہو
کر نہیں سکتی مجھے مایوس شکلِ ظاہری

''اخبارِ تعلیم'' ہی میں مطبوعہ ایک اور نظم ''انکرالاصوات'' بھی ایک مقصد کے تحت لکھی گئی نظم ہے۔اِس نظم میں ایک گدھا اپنے ہینگنے کے سبب سے پردہ اُٹھا رہا ہے۔اُس کے بقول اِنسان کی خوابِ غفلت اُسے خون کے آنسو رُلاتی ہے اور وہ اِنسان کو درسِ عبرت دینے کے لیے ہینگتا ہے۔اُس کے خیال میں اگر گوشِ ہوش ہوں تو اُس کی ہینگ عمرِ رفتہ کا پتا دیتی ہے۔گدھے کی زبان سے کہلائی گئی چند باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

فرض اپنا جو کرے پورا وہی انسان ہے
نام کا ہے آدمی ورنہ حقیقت میں گدھا
مجھ سے بڑھ کر کس نے خدمت کو بنایا ہے شعار
راز سرداری کا کہتے ہیں اِسی میں ہے چھپا
باپ گر وقتِ ضرورت کہہ دیا کیا فائدہ
لطف تو تب ہے رہے عزت مری ہوتی سدا

مل گئی ہے انکرالاصوات کی مجھ کو سند
لاؤڈ اِسپیکر کو لیکن کون کہتا ہے برا
آدمیت کا ہے جوہر انکساری میں نہاں
دیکھ اے صادقؔ ! حقارت سے نہ مجھ کو دیکھنا

سیّد صادق حسین کاظمی مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرانا چاہتے ہیں۔ وہ اُنھیں اُن کی موجودہ پستی اور زبوں حالی کا احساس دِلا کر آمادۂ عمل کرنے کے خواہاں ہیں۔ نظم ''درسِ عمل'' اسی مقصد کی خاطر لکھی جانے والی نظم ہے۔ مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی اِس نظم کو پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے ہم مولانا الطاف حسین حالیؔ کے ''مسدس مدّ و جزرِ اسلام'' کا مطالعہ کر رہے ہوں۔

خبر ہے ہمیں بیش قیمت گہر تھے
ہمیں مایۂ افتخارِ بشر تھے
ہمیں ہفت اقلیم میں جلوہ گر تھے
ہمیں صاحبِ ملک و اورنگ و زر تھے

ہماری غلامی میں علم و ہنر تھا
ہمارے ہی قبضے میں ہر دشت و در تھا

مگر اب تو ہے قابلِ رحم حالت
کہ وہ جاہ و حشمت نہ وہ علم و حکمت
جدھر دیکھیے اب ہے اِفلاس و نکبت
نہ وہ شوق ہے اب نہ وہ عزم و ہمت

پٹک کر ثریا سے ہے سخت حیرت
رہا شیشۂ کاہلی کیوں سلامت

سیّد صادق حسین کاظمی نے چند غزلیں بھی کہی ہیں۔ غالبؔ کی زمین میں اُن کی کہی گئی ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

سخت مشکل میں بھی ہرگز نہ پریشاں ہونا
تم کو منظور ہے گر کام کا انساں ہونا
سازوساماں نہیں درکار رَہِ اُلفت میں
یہی کافی ہے فقط سوختہ ساماں ہونا
صادقِ زار نہ مایوس ہو کہہ کر اشعار
تیری تقدیر میں لکھا ہے سخن داں ہونا

اب سیّد صادق حسین کاظمی کی اُس غزل کا ذکر جس کے ایک شعر کو پڑھے لکھے لوگ بھی علامہ محمد اقبالؔ سے منسوب کردیتے ہیں۔ یہ غزل روزنامہ ''آفتاب'' میں شائع ہوئی تھی۔ چھ اشعار پر مشتمل یہ غزل نذرِ قارئین کی جاتی ہی:

تو سمجھتا ہے حوادث ہیں ستانے کے لیے
یہ ہوا کرتے ہیں ظاہر آزمانے کے لیے
تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لیے
کامیابی کی ہوا کرتی ہے ناکامی دلیل
رنج آتے ہیں تجھے راحت دِلانے کے لیے
آتشِ نمرود گر بھڑکی تو کچھ پروا نہیں
وقت ہے شانِ براہیمی دِکھانے کے لیے
مانگنا کیسا؟ کہ تو خود مالک و مختار ہے
ہاتھ پھیلاتا ہے کیوں اپنے خزانے کے لیے
دست و پا رکھتے ہیں تو بے کار کیوں بیٹھے رہیں
ہم اُٹھیں گے اپنی قسمت کو بنانے کے لیے

☆......☆......☆

اصلاحِ معاشرہ

شرم وغیرت ہے آبروئے جمال

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی
ڈین فیکلٹی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

شرم وحیا انسان کی فطرت ہے۔ یہ بُرائیوں سے بچنے کی راہ ہے۔ اخلاق باختگی کے ماحول میں سیرت وکردار کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ شرم وحیا اس انسانی کیفیت کا نام ہے جو کسی بُرائی کے وجود میں آنے سے پہلے انسان کے دل وضمیر میں متحرک ہوتی ہے اور اسے بُرائی سے بچنے کے اشارے کر دیتی ہے۔ ناشائستہ حرکتوں کے خلاف قوتِ مزاحمت ہے۔ یہ نفس کے ہیجانوں اور خواہشات کے طوفانوں سے لڑنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ حیا ہر حساس اور باضمیر انسان کے دل ودماغ کی دولت ہے۔ شرم وحیا اگرچہ انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے مگر اسے زندہ اور تابندہ رکھنا انسان کے اپنے ارادہ و اختیار پر منحصر ہے۔ کیوں کہ انسان کو اپنے ارادہ وعمل کو نافذ کرنے یا روک لینے کا مکمل اختیار ہے۔ اسی نکتہ کو خالق کائنات نے دو جملوں میں آشکارا کیا ہے: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (الشمس:۸)

[اللہ نے انسان کی فطرت میں گناہ کی صلاحیت اور پرہیزگاری کی صفت دونوں رکھ دی ہے۔]

مولانا مودودی کے الفاظ میں:

> ”اسلام کی مخصوص اصطلاح میں حیا سے مراد وہ شرم ہے جو کسی امر منکر کی طرف مائل ہونے والا انسان خود اپنی فطرت کے سامنے اور اپنے خدا کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ یہی حیا وہ قوت ہے جو انسان کو فحشاء اور منکر کا اقدام کرنے سے روکتی ہے اور اگر وہ جبلت حیوانی کے غلبہ سے کوئی بُرا فعل کر گزرتا ہے تو یہی چیز اس کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔

اسلام کی اخلاقی تربیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ حیا کے اسی چھپے ہوئے مادہ کو فطرت انسانی کی گہرائیوں سے نکال کر علم وفہم اور شعور کی غذا سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ اور ایک مضبوط حاسہ اخلاقی بنا کر اس کو نفس انسانی میں متعین کر دیتی ہے''۔ ا؎

زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا سماجی نظام شرک وبت پرستی کے ساتھ بے حیائی اور بدکاری کے سہارے چلتا تھا۔ وہ لوگ کھلے عام بے حیائی کا ارتکاب کرتے تھے اور اس کو جائز ٹھہرانے کے لیے باپ دادا کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کو مذہبی سند بھی عطا کرتے تھے۔ ان کی اس ناشائستہ حرکت پر گرفت کرتے ہوئے پروردگار عالم نے کہا:

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَائَنَا وَاللهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللهَ لاَ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ (الاعراف:۲۸)

[جب وہ بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اسی راہ پر باپ دادا کو پایا ہے اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ دیجیے کہ اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کی طرف وہ بات منسوب کرتے ہو جو نہیں جانتے۔]

آج بھی مغربی معاشرہ کی رونق اور مغربی تہذیب کی گرم بازاری بے حیائی اور بدکاری کے دم سے قائم ہے۔ بے لباسی فیشن ہے، بے حیائی طرزِ زندگی ہے اور بدکاری تہذیب ہے۔ بے حیائی کے ان قدیم وجدید مظاہر کے درمیان اسلام کا پیغامِ شرم وحیا اور نظامِ عفت وعصمت سرچشمۂ رحمت اور باعث عزت ہے۔ قرآن پکار پکار کر لوگوں سے کہتا ہے:

وَلاَ تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الانعام:۱۵۱)

[بے حیائی کے قریب بھی نہ جاؤ چاہے کھلی ہوئی ہو یا چھپی ہوئی۔]

جسم وجوارح کی بُرائی ہو یا قلب وذہن کی۔ تنہائی ہو یا محفل میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ما من احد اغیر من اللہ من ذالک حرّم الفوَاحِشَ۔ ۲؎

[اللہ سے زیادہ کوئی غیرت مند نہیں ہے، اسی لیے اس نے بے حیائی کو حرام ٹھہرایا ہے۔]

یہی بنیادی فرق ہے مشرکانہ ومادہ پرستانہ تہذیبوں اور اسلامی تہذیب کے درمیان۔ ایک جگہ شرم

وحیا کوڑیوں سے بھی کم قیمت ہے اور دوسری جگہ ہیرے موتی سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ اسلامی تہذیب کے اس درخشاں پہلو کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح اجاگر کیا ہے: **لکل دین خلق وخلق الاسلام الحیاء۔** ۳؎ [ہر دین کا اخلاق ہوتا ہے اور اسلام کا اخلاق حیا ہے۔]

جس حیا کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اخلاقی نظام کی شاہ کلید بتایا ہے، وہ تمام انسانی محاسن کا محور ہے اور تمام پاکیزہ صفات کا مرکز ہے۔ اسی لیے اسے ''خیر کل'' یعنی مکمل بھلائی بھی کہا گیا ہے۔ عمران بن حصینؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حیا مکمل خیر ہے۔ اس پر بشیر بن کعب نے کہا کہ ہم بعض کتابوں میں لکھا پاتے ہیں کہ حیا سے کچھ تو سکینت اور وقار ہے اور کچھ ضعف وناتوانی۔ اس پر عمران بن حصین ناراض ہوگئے، آنکھیں سرخ ہوگئیں اور بولے کہ میں تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث بیان کررہا ہوں اور تم اپنی کتابوں کی باتیں مجھ سے بیان کرتے ہو''۔ ۴؎

انسان کی تہذیب وشرافت اس کی شرم وحیا سے جڑی ہوئی ہے۔ جو شخص مہذب اور بااخلاق ہوگا اس میں شرم وحیا کے جوہر ہوں گے اور جو شرم وحیا سے عاری ہوگا، اس میں تہذیب وشرافت دم توڑ چکی ہوگی۔ کیوں کہ حیا شرافت اور تہذیب کا پہلا زینہ ہے۔ جب شرم وحیا انسان سے رخصت ہوگئی تو اب کوئی بُرا کام کرنے میں اسے عار نہ ہوگا۔ بدکرداری کی راہ میں قدم اٹھانے میں اسے کوئی تامل نہیں ہوگا۔ تہذیب وشائستگی کی حدیں پار کرنے میں اسے کوئی شرمندگی نہیں ہوگی۔ اس نفسیاتی واخلاقی اصول کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

ان مما ادرک الناس من کلام النبوۃ الاولی اذا لم تستحی فاصنع ماشئت ۔۵؎

[پچھلی نبوت کی تعلیمات سے لوگوں کو جو کچھ ملا ہے، اس میں سے ایک یہ ہے کہ اگر تم بے حیا ہو تو جو چاہو کرو۔]

فارسی زبان کا محاورہ ہے ع بے حیا باش ہرچہ خواہی کن

شرم وحیا اور پاک دامنی پر صرف اسلام نے زور نہیں دیا ہے بلکہ تمام آسمانی مذاہب میں اور ساری الہامی کتابوں میں شرم وحیا کو عورت کا زیور اور مرد کی غیرت بتایا گیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ چار چیزیں انبیاء علیہم السلام کی سنت ہیں: (۱) حیا، (۲) خوشبو، (۳) مسواک، (۴) نکاح۔ ۶؎

مخلوق کو خالق کی رضا کا راستہ دکھانے والے تمام انبیاء کرام باحیا تھے۔ ان کی تعلیمات میں شرم و حیا کی اہمیت تھی۔ کسی نبی نے کبھی بے حیائی کا کام نہیں کیا اور نہ کبھی بے حیائی کی تعلیم دی۔ بے حیائی نبیوں کی شان، ان کی دعوت اور ان کی شخصیت کے منافی ہے۔ نمونہ دیکھنا ہو تو یوسف علیہ السلام کی داستان حیات پڑھیے۔ بے حیائی کے ماحول میں گھر کر اور بدکاری کا پیغام سن کر انھوں نے اپنی عزت کا سودا نہیں کیا۔ قید و بند کی صعوبت تو گوارا کرلی مگر اپنے کردار پر حرف آنے نہ دیا۔ یہاں تک کہ دام فریب میں پھنسانے والی مصر کی عورتوں کو کہنا پڑا: مَا هٰذَا بَشَرًا إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ (یوسف: ۳۱) [یہ کوئی انسان نہیں ہے یہ تو ایک محترم فرشتہ ہے۔]

ایک دوسرا نمونہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہے، پاکیزہ، مہذب، شریف اور برگزیدہ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ **لم یکن النبی صلی اللہ علیہ و سلم فاحشا و لا متفحشا**۔ ۷

[رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ بے حیا تھے اور نہ بے حیائی کو پسند کرتے تھے۔]

حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پردہ نشین دوشیزہ سے بھی زیادہ باحیا تھے۔ ۸ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شخص کو بدترین آدمی سمجھتے تھے جس کی بدگوئی و بے حیائی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں۔ ۹

ہر نبی کی دعوت ایمان اور عمل صالح پر مبنی ہوتی ہے۔ ایمان و یقین کی قوت کے ساتھ کردار سازی اور پاکبازی ان کی تعلیم و تربیت کا جوہری حصہ ہوتی ہے۔ یہی دو چیزیں انسان کو روحانی لذت، اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی کا حق دار بناتی ہیں۔ گویا ایمان اور شرم و حیا ایک ہی دریا کی دو لہریں ہیں جو انسان کی روحانی زندگی کو سیراب کرتی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **الحیاء من الایمان و الایمان فی الجنة و البذا من الجفاء و الجفاء من النار**۔ ۱۰ [حیا ایمان کا جزو ہے اور ایمان والا جنت میں جائے گا، جب کہ بے حیائی ظلم ہے اور ظلم کا ٹھکانہ جہنم ہے۔]

آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ **الحیاء شعبة من الایمان**۔ ۱۱ [حیا ایمان ہی کا شعبہ ہے۔] یعنی انسان کے دل میں ایمان ہے تو اس میں شرم و حیا کا مادہ بھی ہے۔ کوئی صاحب ایمان، بے

شرم اور بے حیا نہیں ہوسکتا۔ شرم و حیا رخصت ہوگئی تو سمجھیے کہ ایمان بھی غارت ہوا۔ اس لیے کہ دونوں ایک دوسرے سے مکمل ہوتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

الحیاء و الایمان قرناء جمیعا فاذا رفع احد رفع الآخر۔ ۱۲ے

[حیا اور ایمان دونوں ساتھی ہیں، جب ایک ختم ہوگا تو دوسرا بھی ختم ہو جائے گا۔]

شرم و حیا کو ایمان کا حصہ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقی اور جنسی معاملات ایمان سے الگ نہیں ہیں بلکہ اس کے پابند ہیں۔ یہ انسان کے اختیار پر نہیں چھوڑے گئے ہیں۔ ایمان کے تقاضوں میں شرم گاہ کی حفاظت اور کردار کی حفاظت بہت اہمیت کی حامل ہے اور شرم و حیا اسی کی پہرہ داری کرتی ہے۔ اگر یہ کمزور پڑ جائے تو کردار کے ساتھ ایمان کے جانے کا خطر بنا رہتا ہے۔

حضرت سالم بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی انصاری شخص کے پاس سے گزرے وہ آدمی اپنے بھائی کو حیا کرنے کی وجہ سے تنبیہ کر رہا تھا۔ رسول پاک نے اس سے فرمایا:

دعهٗ ان الحیاء من الایمان ۱۳ے [اسے چھوڑ دو کیوں کہ حیا ایمان کا جزو ہے۔]

ہمارے زمانہ میں اخلاقی قدروں کی پامالی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بے شرمی اور بے حیائی کو جرات اور شرم و حیا کو بزدلی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو جتنا بے حیا ہے اسے اتنا ہی Bold (جری) سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر خوبصورت لڑکیوں کی برہنگی کو جرأت کہا جانے لگا ہے۔ لفظوں کے فریب سے اعلیٰ قدروں کو مٹانے کی سعی کی جاتی ہے۔ یہ شیطانی فریب ہے، انسانی معاشرہ اس کا شکار ہو رہا ہے۔ شیطان بے حیائی کو عام کرنے کے لیے انسان ہی کو آلہ کار بناتا ہے۔ رب کائنات انسانوں کو اس کے دام فریب سے بچنے کی تاکید کرتا ہے اور کہتا ہے:

وَمَن يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (النور:۲۱)

[جو کوئی شیطان کے نقش قدم کی پیروی کرے گا تو وہ جان لے کہ شیطان بے حیائی اور بُرائی کا حکم دیتا ہے۔]

شیطانی تہذیب کے علم بردار چاہتے ہیں کہ عورتوں کے سر پر چادر نہ ہو، سینہ پر دوپٹہ نہ ہو، جسم کے نشیب و فراز کھلے رہیں اور گنہ گار آنکھوں کی لذت دیدار میں اضافہ کرتے رہیں۔ برہنہ سینے

اور کھلی رانیں ترقی کی علامت بن جائیں اور پاکیزگی وشائستگی کو رجعت پسندی کہا جائے۔ بے حیائی ہر گھر میں داخل ہو جائے اور شرم وحیا ہر دل سے نکل جائے۔ اس فاسقانہ ذہنیت کا محاسبہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِيْ الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِيْ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (النور:۱۹)

[جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی پھیل جائے ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔]

اسلامی معاشرہ میں اخلاق و کردار کی حفاظت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ شرم وحیا اور پاکدامنی اس کی پہچان ہے۔ بہز بن حکیم روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم اپنی شرم گاہ کا کتنا حصہ کھول سکتے ہیں اور کتنا ڈھانپ سکتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا:

''اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرو، سوائے اپنی بیوی اور باندی کے کسی کے سامنے نہ کھولو۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ جب لوگ آپس میں مل بیٹھے ہوں؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر تمہارے بس میں ہو کہ تمہاری شرم گاہ کو کوئی نہ دیکھے تو تم ضرور ایسا کرو۔ میں نے پوچھا کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص تنہا ہو تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے حیا کی جائے''۔ ۱۴؎

اسلام نے شرم وحیا اور پاکدامنی کے لیے نظر کی پاکی پر زور دیا ہے اور مرد و عورت دونوں کو اپنی شرم گاہوں کے ساتھ اپنی نگاہوں کی حفاظت کرنے کی تعلیم دی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (النور:۳۰-۳۱)

[مومن مردوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اسے دیکھ رہا

ہے۔ اور مومن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کا اظہار نہ کریں، سوائے اس کے جو خود بخود ظاہر ہو جائے۔]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسروں کی شرم گاہوں سے صرف نظر کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ کیوں کہ یہ بدکاری اور شہوت پرستی کی پہلی منزل ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کوئی مرد کسی دوسرے مرد کی شرم گاہ کی طرف نہ دیکھے، کوئی عورت کسی دوسری عورت کی شرم گاہ کی طرف نہ دیکھے۔ دو مرد ایک کپڑے میں نہ لیٹیں اور نہ دو عورتیں ایک کپڑے میں لیٹیں۔ ١۵؎

اسلامی معاشرہ میں شرم گاہ کی حفاظت اور نگاہ کی حفاظت عفت و پاک دامنی کا جزو لازم ہے۔ جب کہ مغربی معاشرہ میں نہ شرم گاہ کی حفاظت کی کوئی معنویت ہے اور نہ نگاہ کی حفاظت کی کوئی حاجت ہے۔ یہ مغربی اور اسلامی تہذیبوں کا فرق ہے۔ اسلام شائستہ لباس اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور حسن کی نمائش سے گریز کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ جب کہ مغربی معاشرہ میں خواتین کو عریانیت اور فحاشی کی راہ دکھائی گئی ہے اور جنسی آسودگی کا آلہ کار بنایا جاتا ہے۔ بے حیائی اور فحاشی کی نمائش کو تہذیب کا نام دے دیا گیا ہے۔ برہنہ جسموں کی پریڈ اور شہوانی حرکتوں کے اظہار کو ترقی کی علامت سمجھ لیا گیا ہے۔ عورتوں کو اپنے جسم کے پوشیدہ مقامات کھول کر دکھانے کی ترغیب دی جاتی ہے اور خوبصورتی کے اظہار کے نام پر نازک اندام جانیں اپنا سب کچھ ہوس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتی ہیں۔ تہذیب عورت تک محدود ہو گئی ہے اور عورت عریانیت میں سکون پاتی ہے۔ اس وبائے عام سے شریف گھرانوں کی لڑکیاں متأثر ہو رہی ہیں۔ بے حیائی کی یہ عالمی وبا مہذب معاشرہ کو اندر سے کھوکھلا کر چکی ہے اور انسانی عقل پر دبیز پردہ پڑ چکا ہے۔ پہلے مغرب اس راہ پر چلا تھا اب بعض مسلم ممالک بھی بے حیائی کو پھیلانے میں لگے ہیں۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **ما کان الفحش فی شیئ الا شانہ و لا کان الحیاء فی شیئ الا زانہ** ١٦؎

[بے حیائی جس چیز میں ہوگی اسے عیب دار کر دے گی اور حیا جس چیز میں ہوگی اسے سنوار دے گی۔]

حیوانیت شہوت پرستی اور بے حیائی کے سہارے انسانی دماغ اور سماج میں جگہ بناتی ہے اور انسان

کو بدکرداراوراس کی شخصیت کوداغدار کردیتی ہے۔شرم وحیا انسان کواس اخلاقی گندگی سے بچاتی ہے اوراسے پاک بازی اور کردار سازی کی راہ پر لگاتی ہے۔ بے حیائی، بدکرداری اوراخلاق باختگی کے ماحول میں اپنے کردار کی حفاظت کی تدابیر کرنا امت مسلمہ کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ ٹی وی، انٹرنیٹ، اسمارٹ فون نے فحاشی وبدکاری کا سیلاب ہماری خواب گاہوں تک پہنچادیا ہے۔ بُرائی سے بچنا مشکل ہے اوراب بُرائی کا احساس بھی مٹتا جارہا ہے۔ جب کہ عزت وآبرو کی حفاظت شریف انسان کے لیے جان وتن سے زیادہ عزیز ہے۔ علامہ محمد اقبال نے نوجوان لڑکے اورلڑکیوں کو جو نصیحت کی تھی وہ آج بھی قابل عمل ہے:

حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ

☆......☆......☆

حوالہ جات

☆......۱۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، پردہ، رام پور، ۱۹۵۸ء، ص:۲۹۰ ☆......۲۔ الصحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الغیرۃ ☆......۳۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع، سنن ابن ماجه، ابواب الفتن، باب الحیاء ☆......۴۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحیاء ☆......۵۔ سنن ابن ماجه، ابواب الفتن، باب الحیاء ☆......۶۔ سنن ترمذی، ابواب النکاح ☆......۷۔ ایضاً، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الفحش ☆......۸۔ الصحیح البخاری، کتاب الادب، باب لم یکن النبی فاحشا ☆......۹۔ ایضاً ☆......۱۰۔ سنن ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الحیاء ☆......۱۱۔ الصحیح البخاری، کتاب الایمان، باب امور الایمان ☆......۱۲۔ المستدرک للحاکم ☆......۱۳۔ الصحیح البخاری، کتاب الایمان، باب الحیاء من الایمان ☆......۱۴۔ ایضاً ☆......۱۵۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب تحریم النظر الی العورات ☆......۱۶۔ سنن ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الفحش

سوزِ دل

قلم وقرطاس کی اہمیت

مولانا طارق علی عباسی

لغت کے اعتبار سے قلم کے تو کئی معانی ہیں مگر ہمیں جس قلم سے اب اس وقت سروکار ہے، وہ قلم بمعنی لکھنے والے آلہ کے ہے، پھر وہ آج جس بھی شکل میں ہو اور جس سے لکھنے کا کام بھی لیا جاتا ہے، اوراسی طرح قرطاس سے کاغذ اور اس کی جدید شکلیں مراد لی جارہی ہیں، باقی یہ ایک الگ موضوع ہونے کے ساتھ تاریخ کا حصہ بھی ہے کہ مذکورہ چیزیں قدیم زمانے میں کن معنوں میں مستعمل رہی ہیں اور اب عصرِ جدید میں ان کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے۔اب ہم اپنے مدعائے گفتگو پر آتے ہیں کہ اس رنگ و بو کے عالم میں دیگر اہم اشیاء کی طرح قلم وقرطاس اور خط وکتابت کی اہمیت بھی بالکل واضح اور مُسلّم ہے، قلم کی عظمت ورفعت پر صحیفۂ فطرت (قرآن مجید) ہمارے سامنے بولتا شاہد ہے، صُحفِ سماوی اور دیگر کتب کے علاوہ اسلامی دور میں کتابتِ قرآن وحدیث وغیرہ کی تاریخ سے ہر لکھا پڑھا واقف ہے، قرآنِ حکیم کی پہلی وحی اقراء اور سورۂ قلم کی شروعات کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ علم وقلم آپس میں لازم ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، اور دنوں مُہتم بالشان بھی ہیں، قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب مانی جانے والی کتاب **صحیح بخاری** شریف میں امام بخاری علیہ الرحمہ نے **کتاب العلم** میں ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان ہی انہوں نے **کِتابة العلم** رکھا ہے، پھر حضرت الاقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ الابواب والتراجم میں اس جگہ جو ارشاد فرماتے ہیں، وہ ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے، حضرت شیخ الہند قدس سرہ فرماتے ہیں کہ حفاظتِ علم، بقائے علم اور اشاعت و تبلیغِ علم

کے لیے کتابت بھی ضروری ہے اور سہل و انفع ہے، اس لیے **بَاب کِتَابَةِ العِلمِ** منعقد کر کے کتابتِ علم کا استحسان اور امورِ علمیہ کا بغرض بقا و حفاظت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے لکھا جانا ثابت کر دیا، بلکہ اشارۃً علماء کو ترغیب الی الکتابۃ بھی مفہوم ہوتی ہے، حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے اس قیمتی فرمودہ سے بڑے واضح انداز میں علم کو قلم کے ذریعے فروغ دینے کا پتہ چلتا ہے، اس متعلق مزید جانکاری حاصل کرنے کے لیے خطیب بغدادیؒ کی کتاب **تقیید العلم** کی طرف مراجعت کی جائے۔

منجملہ ان سب باتوں کے یہ ایک دوٹوک حقیقت ہے کہ قلم وغیرہ سے لکھی جانے والی تحاریر کے ذریعے ایک زمانے کا دوسرے آنے والے زمانے سے تعلق رہتا آیا ہے، اور اس تحریر ہی کے ذریعے گزرا ہوا قدیم آنے والے جدید میں تبدیل ہوتا رہا ہے، اس کے علاوہ انسانوں کے آپسی معاملات اور کارِ دیگراں میں بھی یہ قلم اور اس سے تخلیق ہونے والی تحریر کی وقعت و ضرورت نمایاں ہے، صرف اسی مذکورہ بات سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قلم و قرطاس اور تحریر کی انسانوں کے ہاں کیا شان اور اہمیت رہتی آئی ہے، تعلیمی نظر سے دیکھیے تو ایک بچہ جب اسکول و مکتب میں داخل ہوتا ہے تو اسے سب سے پہلے اسی قلم و قرطاس اور اس سے جڑے نئے آلات سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک معقولی اور محسوس ہوتی مثال کے ذریعے سمجھیں کہ جیسے تمازتِ آفتاب کے اثر کو ہر جاندار محسوس کرتا ہے تو ٹھیک اسی طرح قلم و قرطاس اور تحریر کو لیجیے یا پھر ان کے نئے اور جدید متبادل کو، تو کون ہے وہ جو ان کے اثرات کو نہیں مانتا؟ یا ان سے نفع اندوز نہیں ہوتا؟ اور ان کو اپنے کام میں نہیں لاتا؟ یا پھر ان کی ضرورت و احتیاج کو نہ مانتا ہو۔ اسی بات کے پیشِ نظر عرض ہے کہ نہ جاننے والے نہ ہی جانیں اور نہ ہی اِس بحث میں اُن سے کوئی غرض ہی ہے، مگر جاننے والے جو خود کو صحیح الفکر مذہبی بھی کہلواتے ہیں خدارا وہ تو اپنی عقلِ سلیم اور فہم و فراست سے کام لیں کہ تحریر کا میدان انہوں نے کن کے لیے خالی چھوڑا ہے؟ اور کیوں چھوڑا ہے؟ یا پھر کیوں چھوڑ رہے ہیں؟ کیا اس میدان کے ذریعے دشمنِ اسلام پھر چاہے وہ جو کوئی ہو اور کسی بھی شکل میں ہو آج تک اپنے باطل اہداف میں کامیاب نہیں ہوا؟ یقیناً ہوا ہے۔ پس ہمیں اس حوالے سے فکرمند رہنا چاہیے کہ آیا اس متعلق ہم اغیار سے اس میدان میں کہیں پیچھے تو نہیں

رہ گئے؟ پیچھے رہ گئے ہیں تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ کیا وہ عوارض دور نہیں کیے جاسکتے جن کی وجہ سے ہم اس میدان کی اُس جدوجہد سے دور ہو گئے ہیں جس میں ہمارے بزرگانِ سلف یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔

اب اگر ہم اپنے آپ پر نظر ڈالیں تو دلی کڑھن سے اور بغیر کوئی ہچکچاہٹ محسوس کیے یہ بات برملا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے احباب کے نزدیک قلم سے نکلی ہوئی تحریر یا تو مختلف قسم کے امتحانات اور ٹیسٹوں کے پاس کرنے یا پھر زیادہ سے زیادہ مادی انتفاع حاصل کرنے تک محدود ہے، اور بہتوں کو تو تحریر کی اصلی اور بنیادی غرض کا پتہ تک بھی نہیں، اگر کسی بیچارے آشنائے غفلت کو معلوم ہے بھی تو سطحی اور وہ بھی اپنے اپنے مفادات کی حد تک۔ اب ذرا کوئی صاحبِ عقل وفہم ہی بتلائے کہ ایسی بےفکری باتوں کے ہوتے ہوئے انقلابُ الامم، امراضِ عصر کی تشخیص وعلاج اور انسانِ جدید جس پر مادہ پرستی اور خفیہ عصبیت وجاہلیت کا نشہ چڑھا ہوا ہے، اسے وحی کے متوازن، مبنی بر فطرت اور ہمہ گیر پیغام سے روشناس کرانے کا کٹھن کام سرانجام پانا کس طرح ممکن ہے؟ کیا یہ راہ اس لائق نہیں کہ ہمارے اہلِ فضل وثروت مسلمان بھائی اس انتہائی اہم اور ضروری راہ سے اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے میں اپنا حصہ ڈالیں؟ کیا کوئی فکر اسلامی سے سرشار صاحبِ اولاد ایسا نہیں ہے جو اپنی اولاد کو اس خالی ہوتے محاذ کی بروقت خبر گیری کرتے ہوئے حفاظتِ اسلام اور شعارِ اسلام کو مستحکم تر کرنے کے لیے اُن کو اِس کے لیے تیار کرے؟ اور کیا ہماری ذمیداری نہیں بنتی کہ رسمی اور پیشہ وارانہ رَوِشوں اور طبعی و دیگر کئی طرح کی منافرتوں سے ہٹ کر اس میدان میں بھرپور اور تمام تر تیاریوں کے ساتھ داخل ہو کر اور اس میدان کے شہسوار بن کر اسلام کی صحیح معنوں میں خدمت کریں جو آج کی شدید ضرورت بھی ہے اور وقت کا لازمی تقاضا بھی ہے۔ اہلِ عقل وتجربہ اس بات کو خوب طرح سے جانتے ہیں کہ جب کسی چیز کا تقاضا شدید ہوتا ہے اور اس سے بے پروائی برتی جاتی ہے تو نتیجے میں نقصان بھی شدید تر ہی پہنچتا ہے، تو کیا کوئی صاحبِ ایمان اپنے آپ کو کسی طرح کا بھی کم ہی درجے میں جان بوجھ کر نقصان دے سکتا ہے؟ یقیناً نہیں دے سکتا۔

تو آیئے، اپنے قلب ودماغ کو میدانِ تحریر کی طرف متوجہ کریں، اس کے نئے چیلینجز سے نمٹنے

کے لیے خود کو ہمہ وقت تیار رکھیں، اور قلم وتحریر کی صلاحیت کو ہم صحیح معنوں میں استعمال کرنا سیکھیں، اس کے ساتھ اپنے قلم کو امتِ مسلمہ اور انسانیت کی بھلائی کے لیے صرف کرنے کا عزمِ صمیم کریں، اور اس بات کا بھی ہر دم خیال رکھیں کہ آپ کی قلمی محنتیں دنیا میں روشنائی پھیلا رہی ہیں یا ظلمت وسیاہی۔ چنانچہ اس بھاری بھرکم ذمے داری کو محسوس کیجیے کہ اس کی بابت کل قیامت میں جب ہم سے پوچھ گچھ ہوگی تو ہم وہاں کیا جواب دے سکیں گے؟ لہٰذا نوجوانانِ ملتِ اسلامیہ کی خدمت میں بڑی ہی دردمندی سے عرض کرتا ہوں کہ آج ضرورت ہے اس امر کی کہ آپ جہاں اَور میدانوں میں مہارت حاصل کر رہے ہیں، وہاں تحریر، خطاطی، خوش نویسی اور مختلف زبانوں پر بھی اپنی گرفت ضرور مضبوط کریں، اور ایسی محنت کریں کہ آپ ایسے معنی خیز لکھنے والے بن جائیں کہ تحریری دنیا میں زمانہ جب بھی کوئی نام لے تو آپ ہی کا لے، قلم میں معنویت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ جس بھی زبان میں لکھیں تو اپنے مافی الضمیر کو اہلِ زبان ہی کے جیسا بیان کریں، تاکہ اُس زبان والے آپ کے بیانِ قلم کو اجنبی اور پرایا محسوس نہ کریں یعنی جس زبان میں لکھیں تو اس پر عبور بھی حاصل کریں، اور اپنے قلم سے خیر وخوبی کو پھیلانے والے بنیں اور مختلف قسموں کی تفریقات کو اپنے قلم سے مٹائیں اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ قلمی محنتوں کے مقاصد کو جان کر لکھنے سے قلم میں وہ تاثیر پیدا ہوتی ہے کہ جس سے ہر زمانے کے لوگ متاثر ہوتے ہیں، اس لیے بے مقصد ہرگز بھی نہ لکھیں۔ اور اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں کہ تحریر کے اس میدان کے حدودِ اربعہ کو بڑی ہی سنجیدگی سے اور گہرائیوں میں جا کر سمجھیں، اور یہ بات محض لکھنے لکھانے تک کی ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اپنے گرداگرد موجود مختلف قسم کے مذہبی وغیر مذہبی ملی وسیاسی، سماجی اور دیگر معیارات کو صحیح اسلامی تعلیمات کے مطابق مطالعے میں رکھ کر پھر خیال واظہار میں وہ پختگی اپنے اندر پیدا کریں کہ جس سے آپ کی تحریر سے شوریدہ ذہنوں کو اطمینان ملے، اور بھٹکے ہوؤں کو راہ یابی مل سکے اور یوں آنے والی مختلف قومیں اور نئی نسلیں بھی آپ کی قلمی محنتوں سے کما حقہ فائدہ اٹھائیں، اگر ایسا کرنے میں آپ کامیاب ہوگئے تو یقین مانیے کہ آپ علمی وادبی اور فکری سطح کی تاریخ کا وہ اٹوٹ حصہ اور مستند حوالہ بن جائیں گے کہ جس کے بغیر مذکورہ تواریخ کبھی بھی مکمل نہیں ہوسکتیں۔

کتب نما

یہ تھے اکابرِ مظاہر

نام کتاب : یہ تھے اکابرِ مظاہر

مصنف : مفتی ناصرالدین مظاہری۔استاد جامعہ مظاہر علوم (وقف)، مدیر ماہنامہ آئینہ مظاہر علوم، سہارنپور

صفحات : ۲۹۲

ملنے کا پتا : مکتبہ تراث الادب، خانیوال، پاکستان (0300-4097744)
مکتبہ الانور، دیوبند (سہارنپور)، انڈیا (8171554526)

مبصر : مولانا عبدالمتین منیری، بھٹکلی (00971555636151)

اللہ تعالیٰ جب کسی نیک کام کی توفیق دینا چاہئیں تو اس کے لیے ایسے اسباب پیدا کرتے ہیں، جو کبھی سان وگمان میں بھی نہیں آتے، آج کی سوشل میڈیا کے دور میں واٹس اپ کوئی ایسی چیز نہیں جسے اہل علم سنجیدگی سے لیں، اور اس پر اپنا وقت صرف کرنے کو کار عبث نہ سمجھیں، لیکن علم و کتاب گروپ کے نام سے جو واٹس گروپ قائم ہوا، اور برصغیر کے مختلف مرکزی دینی تعلیمی اداروں اور مختلف دینی تحریکات سے وابستہ افراد، اور علم ادب سے وابستہ دانشور جب اس میں اکٹھے ہوئے اور اس میڈیم کو استعمال کرنے کے لیے خود پر کئی ایک پابندیاں عائد کیں تو اللہ کے فضل سے یہ کئی ایک علمی وادبی کاموں کی تحریک کا سبب بن گیا۔

عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ جو قلمکار روزانہ کے معمول سے لکھنے کا خود کو پابند کرتے ہیں، ان کی

چند ایک تحریریں دلوں میں وہ حرارت پیدا کر پاتی ہیں جو کسی تحریک کی بنیاد پر جنم لیتی ہیں، اور جن کی ایک قلم کار کو تمنا ہوتی ہے، کیونکہ خانہ پری کے لیے ان میں بھرتی کی چیزیں بھی لادنی پڑتی ہیں، لہٰذا ان میں کبھی کبھار آمد کے بجائے آورد کا شائبہ ہونے لگتا ہے لیکن جب کوئی تحریر کسی تحریک کے نتیجہ میں نکلتی ہے، اور قلم کار کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اسے علم و دانش سے وابستہ ایک سنجیدہ طبقہ پڑھ بھی رہا ہے اور اس کی ان تحریروں کا منتظر بھی رہتا ہے، تو پھر اس احساس کے نتیجہ میں جو تحریر قلم سے نکلتی ہے، وہ دلوں کے تاروں کو چھیڑنے والی اور جذبات کو مہمیز کر دینے والی ہوتی ہے۔ کچھ ایسی ہی تحریروں کا مجموعہ ”یہ تھے اکابر مظاہر“ کے نام سے ہمارے سامنے ہیں۔ جو دلچسپ بھی ہے اور دلوں کو جھنجھوڑنے والی بھی۔

بنیادی طور پر یہ ان تحریروں کا مجموعہ ہے جو برصغیر کی ایک عظیم دینی درسگاہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے استاد اور وہاں سے جاری مجلّے آئینہ مظاہر علوم کے مدیر مولانا مفتی ناصر الدین مظاہری صاحب نے علم و کتاب واٹس اپ گروپ کے ممبران کی خواہش پر لکھنی شروع کی تھیں۔ ان تحریروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بے ساختگی کا پہلو غالب ہے، جو کسی ادبی و تاثراتی تحریر کی ایک بہترین خوبی ہے۔ یہ تحریریں کیسے وجود میں آئیں ان کے بارے میں مصنف سے احوال سنئے، فرماتے ہیں کہ:

> ”گروپ میں لکھتے وقت میرے پیش نظر کوئی مستقل ترتیب نہیں تھی، چلتے پھرتے، بسوں، ٹرینوں، پلینوں اور اکثر و بیشتر رات کے کسی بھی حصہ میں جو بھی واقعہ جہاں یاد آ گیا، فوری طور پر موبائل سے ہی لکھ کر گروپ میں شیئر کر دیا گیا۔“

فن خطابت کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ بہترین خطیب بننے کا طریقہ یہ ہے جب وہ کسی موضوع پر تقریر کا ارادہ کرے تو جن خیالات اور افکار کی چلتے پھرتے آمد ہوتی ہے، انہیں وہ فوراً قلمبند کر کے محفوظ کرتا چلا جائے، پھر ان افکار و خیالات کی تحقیق و تدوین اور کانٹ چھانٹ کا کام کرتا رہے، امریکی صدر ابراہام لنکن کے سوانح نگاروں نے اسے انگریزی کے چوٹی کے خطیبوں میں شمار کیا ہے، اور اس کی تقاریر کی ترتیب اور طریقہ کار کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ چلتے پھرتے جو خیالات و افکار

اس کے ذہن میں آتے انہیں محفوظ کرتا چلا جاتا، اور اپنی تقریر سے پہلے ان کی کانٹ چھانٹ کرتا، اس سے اسے تقریر کے وقت موضوع کے بارے میں سوچنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، بہترین ادبی وفکری تحریریں بھی کچھ اسی طرح ظہور پذیر ہوتی ہیں، کیونکہ کسی تحریک سے ایک مرتبہ جو بات ذہن میں آتی ہے، ضروری نہیں کہ ہمیشہ بوقت ضرورت سوچنے پر وہ یاد بھی آئے۔ اس مجموعہ کے مصنف نے بھی کچھ یہی انداز اپنے اس مجموعے میں اپنایا ہے۔

یہ مجموعہ برصغیر کے مشہور ومعروف دینی تعلیمی ادارے مدرسہ مظاہر علوم سے وابستہ اساتذہ واکابر کی زندگی کے منتشر واقعات ومشاہدات سے تعلق رکھتا ہیں۔

برصغیر کے اہل علم کی زبانوں پر جب دارالعلوم دیوبند کا ذکر آتا ہے تو اس کے ساتھ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کا نام بھی خود بخود آجاتا ہے لیکن اول الذکر سے وابستہ شخصیات جتنی تعداد میں مشہور و معروف ہیں اتنی آخر الذکر کی نہیں ہیں، یہ مدرسہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، مولانا محمد یونس جونپوریؒ جیسے چند ایک بڑے ناموں سے ہی زیادہ معروف ہے لیکن اس سے نسبت رکھنے والے علم وتقویٰ کے آسمان کے آفتاب وماہتاب اپنی تعداد میں اس تعداد سے کہیں زیادہ ہیں۔ جس کا اندازہ اس کتاب سے ہوتا ہے۔

جن لوگوں نے تاج محل دیکھا ہے، انہوں نے محسوس کیا ہوگا، کہ جب اس کے احاطہ میں داخل ہوتے ہیں تو دور سے کچھ خاص نظر نہیں آتا لیکن جب اس کے بیرونی گیٹ میں داخل ہوتے ہیں تو اچانک تاج محل اپنی تمام جولانیوں کے ساتھ اچانک نمودار ہوجاتا ہے، یہ کتاب بھی کچھ اسی نوعیت کی ہے، واٹس اپ کے پیغامات کی آخر کیا اہمیت ہوسکتی ہے؟ اور کیونکر انہیں سنجیدگی سے لیا جا سکتا ہے؟، لیکن جب اس مختصر سی کتاب کی فہرست کھولتے ہیں تو سامنے ستاروں کی جھرمٹ میں اچانک ایک کہکشاں نظر میں آجاتا ہے اور اس کی فہرست مضامین دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور قاری سوچتا ہے کہ اچھا یہ بزرگ بھی مظاہر علوم کے فیض یافتہ اور اکابر میں ہیں، ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا!

مصنف نے مظاہر علوم کے تعارف کے بارے میں خوب کہا ہے کہ

”پڑھے لکھے لوگوں کے لیے نہ تو مظاہر علوم محتاج تعارف ہے نہ ہی علمائے مظاہر محتاج تعریف، یہ سچ ہے کہ شروع سے ہی اس ادارہ کے اکابر نے زاویہ خمول اور گم نامی میں رہنے کو ترجیح دی ہے، وہ اسٹیج سے بھی دور ہی رہے، شہرت سے انھیں کوئی دلچسپی نہ رہی، سادگی اور قناعت ان کا بوریا بستر اور خمول و گمنامی ان کی مملکت تھی، اسی گمنامی اور خمول پسندی کا نتیجہ ہے کہ آج علمائے کرام کا بڑا طبقہ مظاہر علوم کے اصل بانی حضرت مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپور تک سے بالکل ناواقف ہے اور واقفین کا بھی یہ حال ہے کہ انھیں صرف نام سنا ہوا لگتا ہے، کام سے کچھ بھی واقفیت نہیں ہے۔“

اس مجموعے میں منتشر واقعات کو تسبیح کے دانوں کی طرح جوڑا گیا ہے، مصنف نے انہیں مراجع و کتب سے بھی اکٹھا کیا ہے، اور بقول ان کے بہت سے واقعات ایسے ہیں، ”جن واقعات کے حوالہ جات نہیں پائے جاتے لیکن سینہ بہ سینہ چلے آرہے تھے، جن کو مکمل دیانت داری اور ذمہ داری کے ساتھ ضبط تحریر میں لاکر پیش کیا جارہا ہے“۔ یہ باتیں مرتب کی زبانی اچھی بھی لگتی ہیں، کیونکہ آپ کا یہاں کے ماحول کے بارے میں مشاہدہ ہے کہ

”عوام میں خوف خدا دیکھا، میں نے تاجروں میں دینداری دیکھی، عوام کی نماز میں دلچسپی دیکھی، میں نے دیکھا کہ نوجوان اسکولی بچے بھی اپنی جیب میں ٹوپیاں رکھتے تھے تاکہ کہیں بھی ہوں نماز باجماعت میں شامل ہوسکیں، چھوٹے چھوٹے بچوں کو قرب وجوار کی مساجد کے اوقات صلوٰۃ کا پتہ رہتا تھا، یہاں کے خوانچہ فرش، چائے فروش، فروٹ فروش اور عام لوگوں کی زبان پر اکابر کے تذکرے دیکھے، رمضان المبارک کے مہینے میں پورے شہر کے مسلم ہوٹل بند دیکھے، ہر دیندار کو کسی نہ کسی بزرگ سے مربوط دیکھا، عید قرباں کے تینوں دن تمام مسلمان اپنے ہوٹل بند رکھتے تھے، ایک محفل تھی فرشتوں کی جو برخاست ہوئی۔“

ممکن ہے مجموعے میں مذکور بہت سی باتیں اچھنبی لگیں لیکن مرتب نے جو دیکھا ہے، اس کے بعد انکار کی گنجائش نکلنی مشکل ہے، مصنف کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

”میں بھی یقین نہ کرتا اگر میں نے اپنی ان ہی آنکھوں سے فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی

مظفر حسین کے تقدس کو، شیخ الادب حضرت مولانا اطہر حسین کی طہارت کو، ادیب اریب حضرت مولانا انعام الرحمن تھانوی کی کفایت شعاری کو، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوری کے تقوی و تقدس کو، حضرت مولانا زین العابدین علی کی سادگی وتقشّف کو، اور حضرت مولانا حافظ فضل الرحمن کلیانوی کے زہدوورع کو نہ دیکھ لیتا، لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکرو احسان ہے کہ میں نے شر القرون میں خیر القرون کے چہرے دیکھے، میں نے مظاہر علوم میں انسانوں کی شکل میں چلتے پھرتے فرشتے دیکھے، میں نے سہارنپور میں دین ودیانت کا بول بالا دیکھا۔"

مظاہر علوم جس شخصیت کی طرف منسوب ہے، ان کے بارے میں مصنف ذکر کرتے ہیں:

"مدرسہ مظاہر علوم، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ کی طرف منسوب ہے، جو کہ حضرت مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپور کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں۔۔۔ یکم رجب المرجب ۱۲۸۳ھ میں جب مظاہر علوم کی بنیاد رکھی گئی اور آپ کو تدریس کے لیے بلایا گیا تو تیس روپے کے حقیر وظیفے کے لیے آپ نے سو روپے ماہانہ کی تنخواہ چھوڑ دی۔"

بانی مظاہر حضرت مولانا سعادت علی فقیہ رحمہ اللہ علیہ کے بارے میں مصنف کی فراہم کردہ یہ معلومات مظاہر علوم کی مسلمانانِ ہند کے لیے تاریخی اہمیت اجاگر کرتی ہے کہ:

"حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی کے معاصر ومعتمد، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپور کے استاذ گرامی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے استاذ الاساتذہ، مظاہر علوم کے بانی اور حضرت سید احمد شہید بن عرفان رائے بریلی کی جماعت کے رکن رکین، فقیہ عصر حضرت مولانا سعادت علی علیہ الرحمہ کے تفصیلی حالات اور خدمات ہنوز پردہ خفا میں ہیں، گمنامی اور زاویہ خمول میں پوری زندگی گزاری، نہ والد اور تاریخ ولادت کا پتہ نہ خاندان اور شجرہ نسب کا علم بمشکل سے دو چار واقعات کا علم ہوسکا ہے، نزھة الخواطر، مظاہر علوم کا ریکارڈ، کتاب سید بادشاہ کا قافلہ، آپ بیتی، علماء مظاہر علوم، نفح المشموم وغیرہ دو چار ہی کتابیں ہیں جو ماخذ کے لیے دو چار سطور فراہم کرتی ہیں ورنہ تاریخ کی تقریبا تمام کتابیں فقیہ سہارنپور کے تذکرے سے خالی نظر آتی ہیں۔ حضرت مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپور سے مشہور تھے،

۱۲۸۳ھ میں مظاہر علوم کی شروعات اپنے گھر سے کی، گھر پر ہی بچوں کو پڑھاتے تھے، طلب زیادہ ہوئی تو کرایہ کا ایک مکان لے لیا، کچھ تعداد اور بڑھی تو قاضی کی مسجد میں تعلیم جاری کردی، اسی دوران ۱۲۸۶ھ میں آپ کا وصال ہوگیا اور مسجد شاہ نوری کے متصل تدفین عمل میں آئی، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی جیسی نیک طینت ہستیاں مل گئی تھیں جنہوں نے بانی محترم کے انتقال کے بعد تعلیمی سلسلہ کو سنبھالا۔"

شیخ القرآن حضرت مولانا حسین علی الوانی رحمۃ اللہ علیہ، جن کے توسط سے پاکستان اور افغانستان کے علاقوں میں تفسیر قرآن کے دروس کی بہار چلی، اور اس سلسلے کے بزرگوں میں مفسر قرآن احمد علی لاہوریؒ، شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ، اور شیخ القرآن پنج پیر وغیرہ نے جو شمعیں جلائی تھیں، ان کی روشنی اب بھی فضاؤں کو منور کررہی ہے، لیکن کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ وہ مظاہر علوم کے فیض یافتہ تھے، آپ کی بے نفسی اور للّٰہیت کے بارے میں یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"**خادم الطلبہ:** خادم الطلبہ کہنا بڑا آسان ہے لیکن طلبہ کی خدمت کر کے دکھانا بڑا مشکل ہے، آپ اپنے مدرسہ کے طلبہ کے حقیقی خادم تھے، طلبہ سے بے تکلف رہتے، ان کی آسانیوں اور راحتوں کا خیال فرماتے، یہاں تک کہ طلبہ جب نیند کی آغوش میں ہوتے آپ کنویں سے پانی نکالتے، وضوخانے پر موجود تمام لوٹوں کو بھرتے، فجر میں جب طلبہ دیکھتے کہ تمام لوٹے پانی سے بھرے ہوئے ہیں تو تعجب کرتے کہ یہ خدمت رات کی تاریکی میں کون انجام دے جاتا ہے۔ ایک رات ایک طالب علم نے عزم کیا کہ پتہ تو کروں کہ آخر وہ نادیدہ محسن ہے کون؟ طالب علم رات بھر جاگتا رہا، ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا، یہاں تک کہ تہجد کے وقت لوٹوں کے کھنکنے، کنویں سے پانی نکالنے کی آوازیں مسموع ہوئیں، قریب جا کر دیکھا تو مفسر قرآن حضرت مولانا حسین علی الوانی تھے۔"

کتاب میں شیخ التفسیر مولانا محمد زکریا قدوسیؒ جیسی شخصیات کا بھی تذکرہ ہے، جن کا ذکر کتابوں میں شاذونادر ہی ملتا ہے، ان کے بارے میں امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی یہ شہادت شاید

حیران کردے کہ:

”سیرت نبوی کے موضوع پر میں خود بھی تقریر کرلیتا ہوں اور اہم علماء سے بھی اس موضوع پر مختلف تقریریں میں سنی ہیں لیکن سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موضوع پر میں نے حضرت مولانا محمد زکریا قدوسی گنگوہی کی تقریر سنی تو حیرت زدہ رہ گیا، اس لیے کہ آپ کی تقریر نہایت ہی عجیب وغریب ہے۔“

مولانا قدوسی کی امانت اور احتیاط کا یہ واقعہ بھی سن لیجیے:

”ہریانہ ایک جلسہ میں تقریر کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا قاری شریف احمد بانی جامعہ اشرف العلوم گنگوہ خادم کی حیثیت سے ہمراہ تھے۔ واپسی پر منتظمین نے مسور کی دوعدد گٹھری یہ کہہ کر دے دیں کہ دس کلو والی مدرسہ کے لیے ہے اور پانچ کلو والی آپ کی ہے۔ حضرت مولانا سہارنپور تشریف لے آئے، اگلے دن قاری شریف احمد صاحب سے پوچھا کہ مسور کہاں ہے؟ قاری صاحب نے عرض کی مدرسہ والی دس کلو مطبخ میں جمع کردی ہے اور پانچ کلو جو آپ کی تھی، وہ میں نے آپ کے گھر پہنچا دی ہے۔ اتنا سنتے ہی بہت خفا ہوئے اور فرمایا: ”ہمیں کون دے ہے بھائی! ہدیہ تو وہ ہے جو یہاں بیٹھے بٹھائے آئے، ہم لوگ مدرسہ کے کام سے گئے تو اس نے مدرسہ کو دی پھر اس نے خیال کیا ہوگا کہ مولوی بھی للچا رہا ہوگا تھوڑی اسے بھی دے دو۔“

کتاب اس قسم کے جواہر پاروں سے بھری پڑی ہے، امید ہے کہ ہمارے مدارس دینیہ کے طلبہ ومدرسین کے حلقے میں یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی، تعلیم وتربیت کے میدان میں یہ ان کی ایک شدید ضرورت بن جائے گی، کتاب کے ناشر مولوی محمد بشارت نواز ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں، جو انھوں نے علم وکتاب واٹس اپ گروپ سے جنم دینے والے ”النخیل، احوال مطالعہ نمبر“ (یادگارِ زمانہ شخصیات کا احوالِ مطالعہ) کے بعد طلبہ وفارغین کے لیے اس قیمتی زادِ راہ کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا، اور اس سلسلے کے مزید سلسلوں کو منظرِ عام پر لانے کے لیے کوشاں ہیں۔

☆......☆......☆

مرے نام آتے ہیں

"النخیل" کا تازہ شمارہ

[پروفیسر محمد یونس میو، ایسوسی ایٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج آف کامرس، گجرانوالہ]

السلام علیکم: آپ کا وقیع جریدہ آج ہی ملا ہے، آپ نے میری درخواست کو پذیرائی بخشی، اس کے لیے بہت شکریہ۔ مشمولات میں مولانا ابن الحسن عباسی، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر امجد علی شاکر، مولانا نعیم الرحمن صدیقی ندوی اور مولانا محمد قمر الزماں ندوی کے مضامین پر نظر ٹھہرتی گئی، مفتی راشد میرے آبائی شہر سے ہیں، اس لیے ان کی تحریر "استقبال رمضان" بھی پڑھی گئی، "خطبات عزیزی" پر جناب کا تبصرہ پسند آیا کہ مصنف کا ضروری تعارف بھی مبصر کے پیش نظر رہا۔

حضرت مولانا ابن الحسن عباسیؒ کے مضمون کا عنوانی مصرہ یوں ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ " کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں"، ڈاکٹر فراقی صاحب ایک کہنہ مشق ادیب، منفرد نقاد، ماہر اقبالیات اور برصغیر جسے وہ بر عظیم کہتے ہیں، کے دینی اور تحریکی ادب کا بڑا حوالہ ہیں۔ ان کا مقالہ " اکبر الہ آبادی۔۔۔ ایک نیا بیانیہ" ادبی اور تہذیبی مطالعہ پر مبنی ہے، جس میں عہد حاضر کا حوالہ ایک فکر انگیز امر ہے۔

ڈاکٹر شاکر صاحب کا مضمون جہاں ان کے ہمہ گیر مطالعہ کی خبر دیتا ہے، وہاں زبان و بیان پر ان کی دسترس بھی ظاہر کرتا ہے۔ مولانا دریا بادی پر مولانا نعیم ندوی کا مضمون بھی اچھا ہے لیکن انتہائی مختصر، اس احساس کی وجہ یہ ہوسکتی کہ اس موضوع پر فراقی صاحب کا مقالہ نظر سے گزرا ہے، اس کا ایک باب اسی عنوان سے ہے۔ اردو صحافت کے دوسو سال" بہت بڑا عنوان ہے اور بہت بڑا اعلان ہے، لیکن چار صفحات میں کیا حق ادا ہوتا، البتہ آغاز اچھا تھا خاص طور شعر خوب ہے۔

کوئی شک نہیں کہ "النخیل" کا معیار رفتہ رفتہ بلند ہوا جاتا ہے۔ جس کے پس منظر میں مولانا عباسی مرحوم کا اخلاص اور آپ کی گراں قدر علمی و ادبی کاوشیں کارفرما ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ النخیل کی ٹیم کے علم میں مزید برکت دے اور یہ سلسلہ یونہی جاری وساری رہے۔ آمین

محمد یونس

۱۶ اپریل ۲۰۲۲ء

علم و کتاب

کتاب کا عالمی دن

ڈاکٹر ظہیر احمد بابر

کتاب کی اہمیت ہر دور اور ہر خطہ میں مسلم ہے علم دوست معاشروں میں کتب بینی کا رواج عام ہوتا ہے اور جن معاشروں کے اذہان بوسیدہ ہوجاتے ہیں، وہاں کتب بینی کا رجحان ختم ہونے لگتا ہے کتب بینی کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی ذیلی تنظیم یونیسکو نے ۱۹۹۵ء میں ہر سال ۲۳ اپریل کو جملہ حقوق محفوظ بنانے کا دن منانے کا فیصلہ کیا۔

اس دن کو منتخب کرنے کی وجہ ولیم شیکسپیئر کی برسی اور دیگر مصنّفین کا یوم پیدائش یا یوم وفات تھا، دنیا کے سو سے زیادہ ممالک میں کتاب کے عالمی دن کے طور پر ہی منایا جاتا ہے، پاکستان میں بھی کتابوں کا عالمی دن ۲۳ اپریل کو ہی منایا جاتا ہے مگر یہاں اس دن کی پذیرائی یورپ اور امریکہ کی طرح نہیں ہوتی، یہ دن سوائے چند ادبی حلقوں جیسا کہ قائداعظم لائبریری، گورنمنٹ پنجاب پبلک لائبریری، پاک ٹی ہاؤس الحمراء، پیلاک اور ایوان اقبال کے اور خبروں میں بحیثیت خبر نشر کرنے سے زیادہ نہیں منایا جاتا۔

اس لیے یہ کہنا بے جانا ہوگا کہ یہ دن خاموشی سے گزر جاتا ہے، حکومتی سطح پر اس دن کی پذیرائی نہ ہونا بھی اس کے خاموشی سے گزر جانے کی ایک وجہ ہے۔

کتاب انسانی زندگی کا لازمی جزو ہے جو اس کی ذہنی استعداد اور صلاحیتوں کو ابھارتی ہے، انسان کی سوچوں کو وسعت دیتی ہے اور غور وفکر کے نئے در کھولتی ہے، یہ ایک تلخ حقیقت بھی ہے کہ کتب بینوں کی تعداد میں کمی آرہی ہے جس کی ایک بڑی وجہ مہنگائی جبکہ دوسری اہم وجہ کتابوں کی آن لائن موبائل اور انٹرنیٹ پر دستیابی ہے، اس کے ساتھ ساتھ دور جدید میں ای بک ریڈر کنڈل Kindal

جیسی ڈیوائس بھی کتابوں کوخریدنے میں کمی کا باعث ہے۔کیونکہ کنڈل میں بیک وقت پانچ ہزار کتابیں آسکتی ہیں جس طرح انٹرنیٹ کا عروج خطوط ورسائل کے ذریعے پر حاوی ہوگیا ہے،اسی طرح کتابوں کی رونمائی،نمائش اوراشاعت میں کمی آتی جارہی ہے۔

صرف چند ادارے جن میں اردو سائنس بورڈ اور پاکستان سائنس اور ٹیکنالوجی انفارمیشن سنٹر وغیرہ شامل ہیں، کتابوں کی اشاعت میں خاطر خواہ کام کررہے ہیں،زیادہ تر بین الاقوامی مصنّفین کی کتب ہی کے تراجم شائع کردیئے جاتے ہیں،ان کتابوں کے نوٹ یا خلاصے بنا کر طلبہ کی آسانی اور کاروباری مفاد کے لیےکم قیمت پر مارکیٹ میں فروخت ہوتے ہیں،اس طرح کے مواد کی دستیابی سے طلبہ میں بھی کتب بینی کے رجحان میں کمی آئی ہے۔

پاکستان میں کتاب لکھنا ایک مشکل عمل بن چکا ہےاوراس سے بھی مشکل اس کتاب کوشائع کروانا ہے۔عمومی مشاہدہ ہے اگرکسی نے کتاب لکھ لی ہےتو وہ کتاب یا تو بطورتحفہ دی جاتی ہے یا مصنف سے مانگ لی جاتی ہے،اس رویئے سے کتاب کے مصنف کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، یہ رواج مصنّفین اور کتب کے ساتھ ناانصافی ہے،کتابوں کی اشاعت میں کمی کا اثر اس طرح پڑا ہے،بہت سے ناشرین اس کاروبار کو بند کرچکے ہیں،لاہور کے رہنے والوں کے لیے مال روڈ پر فیروزسنز کی دکان اہم مرکز تھی جوکہ کتب بینی کا شوق معدوم ہوتے ہی بند ہوگئی ہے،وطن عزیز میں جید مصنّفین اوراد یبوں کی کمی نہیں، مگران کومواقع اوروسائل فراہم نہیں کیے جارہے۔

بحیثیت قوم ہماری کتابوں سے دوری کی بڑی وجوہات غربت بے روزگاری اورشرح خواندگی میں کمی ہے۔لوگوں کی ترجیحات میں کتب کی خریداری یا کتابوں کی نمائش دیکھنے کا شوق نسبتاً کم ہے،آج سے پندرہ بیس سال پہلے تو کتب بینی ایک قابلِ ذکر عادت تھی،لوگوں میں مطالعہ کا شوق تھا،اکثر دورانِ سفر لوگوں کے ہاتھوں میں کتابیں نظر آجاتی تھیں،ایک دور میں بذریعہ ریلوے سفر کرتے ہوئے یہ نظارے تو دیکھے گئے مگراب ایسا کوئی مسافر شاذونادر ہی نظر آتا ہے جو کتاب ہاتھ میں لیے پڑھ رہا ہو۔ریلوے اسٹیشن اور بسوں کے اڈوں پر اخبار ورسائل اور کتب کی دکانیں بکثرت موجود ہوا کرتی تھیں جواب ناپید ہوچکی ہیں،اس کی وجہ ہاتھوں میں موبائل فون کی موجودگی کوبھی کہا

جا سکتا ہے جو دوران سفر مسافروں کا دل بہلانے کا سبب بن چکے ہیں۔ اب کتابوں کی جگہ مسافروں کے ہمسفر موبائل فون ہو چکے ہیں۔

کتب بینی کی روایت معدوم ہونے کی بہت سی وجوہات میں قابل ذکر وجہ حکومت کی عدم توجہی بھی قرار دی جا سکتی ہے، ایک دور تھا جب گلی محلوں میں چھوٹے چھوٹے کتب خانے موجود ہوا کرتے تھے جو اب تقریباً معدوم ہو چکے ہیں، عوامی لائبریریوں کی تعداد میں خاطر خواہ کمی آئی ہے، بڑے شہروں میں ابھی بھی بہت شاندار لائبریریاں ہیں مگر چھوٹے شہروں میں ایسی سہولیات کم میسر ہیں، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اقدامات کی ضرورت ہے نیز کتابوں کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کے لیے موثر قوانین کی تشکیل بھی ضروری ہے، اس امر پر زور دیا جانا چاہئے کہ سکول کالجوں کی سطح پر کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا جائے جس میں اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ بچے با آسانی اپنی جیب خرچ سے کتابیں خرید سکیں تاکہ ان میں کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔

عالمی یوم کتاب کو منانے کا مقصد معاشرے میں کتب بینی اور علم کو عام کرنا ہے، اس کے رجحان کو فروغ دینا ہے، اس سلسلے میں یہ ضروری امر ہے کہ اس دن کو حکومتی سطح پر منایا جائے۔ خاص طور پر ڈیجیٹل دور میں پیدا ہونے والی نسل کو کتاب کی اہمیت سے روشناس کرانا ضروری ہے، بحیثیت قوم یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی آنے والی نسل کو کتب بینی کا عادی بنائیں تاکہ عہد رفتہ کی اس روایت کو دوبارہ زندہ کیا جا سکے، جب انفرادی، اجتماعی اور قومی سطح پر ادبی و علمی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ ادبی تقریبات یا کتب کی نمائش کو سالانہ سطح پر کرنے کی بجائے انہیں تین یا چھ ماہ کے وقفے کے بعد منعقد کیا جانا چاہئے اور اس طرح کہ تقریبات کی خاطر خواہ تشہیر کی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت یقینی ہو۔

کتب بینی کے شوق کو تسکین دینے کے لیے لائبریریز کے استعمال کو فروغ دینا بہت ضروری ہے تاکہ کتب بینی کے شائقین کو مہنگی اور نایاب کتابوں تک با آسانی رسائی حاصل ہو۔ ان سب تجاویز پر عمل درآمد ضروری ہے کیونکہ کتاب دوست قوم ہی ترقی کے زینے طے کر سکتی ہے۔

کتب نما

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کے تبصرے

نام کتاب	:	مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کے تبصرے (دو جلدیں)
مرتب	:	مولانا سید زین العابدین (فاضل جامعہ علومِ اسلامیہ، بنوری ٹاؤن)
ملنے کا پتا	:	مکتبۃ التبلیغ، شادمان ٹاؤن، کراچی (0333-2063058)
مبصر	:	محمد بشارت نواز (نائب مدیر ماہنامہ النخیل)

ندوۃ المصنّفین، ماہنامہ برہان اور اس کے بانی مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۰۷-۱۹۸۵ء) کا نام علم و کتاب سے وابستہ حضرات کے لیے نیا نہیں ہے، البتہ اپنے بعض نو جوان طالب علم ساتھیوں کی معلومات کے لیے ذکر ضروری ہے۔ ۱۹۳۸ء میں مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ نے دار العلوم دیوبند کے اپنے چند نو جوان، ذی استعداد اور تازہ دم علمی رفقاء جیسے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھیؒ اور مولانا حامد الانصاری غازیؒ کے ساتھ مل کر دہلی میں ندوۃ المصنّفین کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اس ادارے سے ایک علمی، ادبی و تحقیقی مجلہ "ماہنامہ برہان" بھی جاری کیا، مولانا اکبر آبادیؒ ہی اس کے مدیر مقرر ہوئے اور ۱۹۸۴ء تک (چند ماہ کے علاوہ) تقریباً آپ ہی اس کے مدیر رہے۔

ندوۃ المصنّفین اور ماہنامہ برہان کو علمی، تحقیقی و ادبی حلقوں میں بہت جلد بلند مقام حاصل ہوگیا، ندوۃ المصنّفین سے علمی و تحقیقی کتابوں کی اشاعت ہونے لگی تو ماہنامہ برہان میں علم و نظر، بحث و تحقیق، ادب و تنقید، تاریخ و تذکرہ، تعارف و تبصرہ ہر موضوع پر شامل مضامین نے پورے برصغیر میں دھوم مچا

دی۔اس عہد کے نامور محققین، ناقدین، ادبا و شعرا کی تحریریں اور کلام ماہنامہ برہان میں چھپنے لگے۔

مولانا اکبر آبادیؒ قدیم و جدید ہر دو علمی سرچشموں کے فیض یافتہ تھے، دارالعلوم دیوبند میں چوٹی کے اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع ملا، جن میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا اعزاز علی امروہیؒ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نمایاں ہیں۔عصری تعلیم میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مولوی، منشی اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کیے تو بعد ازاں دہلی یونیورسٹی سے پہلے ایم اے عربی میں یونیورسٹی میں ٹاپ کیا اور پھر ایم اے انگریزی کیا۔آپ ایک جانب دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن اور دارالعلوم دیوبند کی شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائریکٹر رہے تو دوسری جانب بڑے عصری تعلیمی اداروں میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، ۱۹۴۳ء میں سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں تقرر ہوا، ۱۹۴۷ء میں مدرسہ عالیہ، کلکتہ کے پرنسپل مقرر ہوئے، ۱۹۵۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات کے صدر منتخب ہوئے، آپ کی محنت سے ہی اس شعبہ میں پی ایچ ڈی کا اجرا ہوا، اس کے علاوہ بھی آپ کئی اہم اداروں میں خدمات انجام دیتے رہے۔

آپ ایک باکمال مصنف بھی تھے، آپ نے ایک درجن سے زائد کتابیں تحریر کیں، جن میں سے بعض کتابیں مختلف تعلیمی اداروں کے نصاب میں بھی شامل ہوئیں۔علمی و تحقیقی حلقوں میں آپ کا زیادہ تعارف ماہنامہ برہان کے مدیر کی حیثیت سے ہی ہوا، جس کا اداریہ آپ "نظرات" کے عنوان سے لکھتے رہے، جس میں آپ اپنے خاص اسلوب میں قومی و ملی مسائل، ملکی صورتحال، سماج اور تعلیمی شعبوں کی ضروریات سمیت ہر موضوع پر اپنی جچی تلی رائے، متوازن فکر سنجیدگی اور متانت سے پیش کرتے تھے، اداریہ کا ایک حصہ "وفیات" کے عنوان سے ہوتا تھا، جو آپ ہی لکھتے تھے، جنہیں وفیات کے نام سے جمع کر دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ مختلف علمی موضوعات پر مفصل و مبسوط مقالات تحریر کیے، جو برہان میں شائع ہوتے رہے۔

ان کے علاوہ برہان کا ایک سلسلہ نئی شائع ہونے والی کتابوں کا تعارف و تبصرہ بھی تھا، جو مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ اکثر خود ہی تحریر کرتے رہے، جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اکبر آبادیؒ

ایک بہترین مبصر بھی تھے، آپ نے مختلف موضوعات پر گراں قدر، علمی و تحقیقی شاندار تبصرے کیے، جن میں پوری دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو محسوس کیا، وہی قلم بند کر دیا، اسی لیے ان تبصروں میں تعریف بھی ہے تو سنجیدہ تنقید بھی، کتاب کی خوبیوں کا بیان ہے تو خامیوں کا ذکر بھی، اختصار اور جامعیت ہے تو موقع کی مناسبت سے طوالت بھی، جس سے قاری بڑی حد تک کتاب سے واقفیت حاصل کر لیتا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ نے ۱۹۳۸ء سے ۱۹۸۴ء تک سینکڑوں کتابوں، رسالوں کا تعارف اوران پر تبصرے تحریر کیے، جو ماہنامہ برہان کے سینکڑوں شماروں کے ہزاروں صفحات پر بکھرے ہوئے تھے، شدید ضرورت محسوس کی جاتی تھی کہ اس نایاب ذخیرہ کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے جو علم و تحقیق سے وابستہ افراد کے لیے ایک عظیم سوغات ثابت ہو۔ دو برس قبل کرونا وائرس سے بچاؤ کے لیے لگے لاک ڈاؤن کو غنیمت جان کر نوجوان عالم، جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے ہونہار فاضل مولانا سید زین العابدین صاحب نے ماہنامہ برہان کے تمام شماروں سے وہ تبصرے جمع کرنا شروع کیے اور دس ماہ کے قلیل وقت میں ان سینکڑوں تبصروں کو نہ صرف جمع کیا بلکہ ان کی کمپیوٹرائز کمپوزنگ بھی مکمل کر کے سب کو حیران کر دیا، وہ اس سے قبل بھی کئی تصنیفی کارنماہائے نمایاں انجام دے چکے ہیں۔

مولانا اکبر آبادی مرحوم کے یہ تبصرے تقریباً سولہ سو صفحات پر مشتمل ہیں، جنہیں دو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ان تبصروں کو قرآنیات، حدیثیات، عقائد و ایمانیات وغیرہم ۲۳ موضوعات میں تقسیم کیا ہے، ہر موضوع کے تحت تبصروں کو کتابوں کے ناموں کے حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے، اردو میں اس قدر کتابوں کا ایک جگہ تعارف شاید ہی کہیں اور ملے۔

مولانا سید زین العابدین صاحب نے انتہائی محنت سے جو کارنامہ انجام دیا، اس کی قدردانی یہ تھی کہ اس پر انہیں خراج تحسین پیش کیا جاتا اور اس مجموعہ کی خوب پذیرائی ہوتی، ناشرین اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور بڑے پیمانے پر اس کی اشاعت ہوتی اور قدردان اسے خریدتے لیکن بدقسمتی سے یہ مجموعہ ایک سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود کسی بڑے ناشر کا منتظر رہا، مرتب یہ مجموعہ بغیر کسی

رائلٹی کئی کتب خانوں کے مالکان کو چھاپنے کی پیشکش کرتے رہے، ایک کتب خانے کے مالک کے سوا کہیں سے کوئی مثبت جواب نہ ملا، جنہوں نے مثبت جواب دیا، چند ماہ کے بعد وہ بھی عذر کرنے لگے، بالآخر مرتب نے خود ہی ڈیجیٹل پرنٹنگ کے ذریعے انتہائی محدود تعداد میں عمدہ کاغذ پر شائع کرنے کا فیصلہ کیا، جس کی وجہ سے اس کی قیمت میں اضافہ بھی ناگزیر تھا، اسے برداشت کرتے ہوئے انتہائی محدود تعداد میں یہ تبصرے شائع کیے گئے ہیں، اس اشاعت پر مرتب کتاب مولانا سید زین العابدین صاحب کو داد دیئے بغیر چارہ نہیں ہے۔کوئی ناشر اب بھی اسے بڑے پیمانے پر شائع کرے تو یہ علم و کتاب کی بڑی خدمت ہوگی۔

"مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے تبصرے" کے عنوان سے جو مجموعہ مرتب کیا، اس میں مختلف موضوعات کے تحت کتابوں پر تبصروں کو درج ذیل تعداد میں تقسیم کیا گیا ہے:

قرآنیات: ۷۲، حدیثیات: ۵۵، عقائد و ایمانیات: ۸۷، فقہیات و اصلاحات: ۱۳۴، احسانیات (تصوف وسلوک): ۱۷، سیرتِ مبارکہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ۵۰، تذکرہ انبیاء کرام علیہم السلام: ۲، حالاتِ حضرات صحابہ کرام واہل بیت: ۲۸، تذکرے وسوانحات اور آپ بیتیاں: ۲۴۳، تاریخ: ۱۴۸، بیانات ومواعظ: ۲۷، مکتوبات: ۲۷، لغات: ۱۰، زبان وادب، مقالات ومخطوطات اور کتب خانوں کے تعارف پر مشتمل کتب: ۱۰۱، سفرنامے: ۲۲، درسیات: ۳۳، رسائل وجرائد: ۵۷، خصوصی اشاعتیں اور سال نامے: ۱۱۱، مثنویات: ۱۴، شعریات: ۱۲۶، کہانیاں، ڈرامے اور افسانے: ۱۳، عملیات: ۰۱، انگریزی کتب: ۲۷ اس طرح کتاب میں کل ۱۳۹۶ کا تعارف وتذکرہ اور ان پر تبصرے موجود ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے مختلف موضوعات کی کتابوں پر بہترین تبصرے ان کے مطالعہ کی وسعتوں پر دلالت ہے، نہ صرف مطالعہ وسیع وعریض بلکہ آپ کا مشاہدہ عمیق اور آپ کی نظر میں گہرائی اور نظریہ میں گیرائی تھی، آپ کے تبصرے انتہائی جامع اور پُر مغز، جس میں کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کا کھلا بیان ملتا ہے، پتہ چلتا ہے کہ مولانا ہر تبصرہ کتاب کا باریکی بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد لکھتے تھے، ان تبصروں میں آپ کہیں ٹھیٹھ عالم تو کہیں محقق، کہیں ادیب، کہیں نقاد تو کہیں مؤرخ نظر آتے ہیں، یہ متنوعانہ شان ان کی ایسی خصوصیت ہے جو انہیں اپنے زمانہ کے اہلِ علم میں ممتاز کرتی ہے۔

کتاب میں شامل تبصرے آج کل کے روایتی تبصرہ نگاروں کے تبصروں کے برعکس اگرچہ مختصر لیکن بچے تلے ہیں کہ قاری بڑی حد معلومات حاصل کر لیتا ہے لیکن بعض تبصرے انتہائی طویل ہیں جیسے جلد اول، صفحہ: ۲۵۲ "مذہب اور سائنس" پر تبصرہ ۱۱ صفحات پر مشتمل ہے، اسی جلد میں صفحہ: ۳۲۴ پر مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب "**جامع المجددین**" پر تبصرہ ۹۵ صفحات پر محیط ہے، جس میں آپ اپنے مزاج کے مطابق خوبیوں کے ساتھ نقد کرنے سے پہلے لکھتے ہیں:

"اس لحاظ سے فاضل مرتب کی یہ کوشش ہر طرح لائق تحسین اور سزاوارِ آفریں ہے لیکن ہم اپنی تبصرہ نگاری کا فرض سمجھتے ہیں کہ اس کتاب کی مذکورہ بالا خوبیوں کے ساتھ ان چند چیزوں کی طرف اشارہ کر دیں جو پھولوں کے اس دستہ میں کانٹوں کی طرح کھٹکتی ہیں، فاضل مرتب کی سعادت مندی طبع اور سلامت روی مزاج سے توقع ہے کہ انہوں نے جس جذبہ خدمت دین کے زیرِ اثر اس اہم اور عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا ہے، اس کے پیشِ نظر وہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ان معروضات پر غور فرمائیں گے کہ ہمارا مقصد صرف اصلاح ہے کسی بلند پایہ شخصیت پر نکتہ چینی اور خردہ گیری نہیں۔"

اسی طرح جلد اول، صفحہ: ۵۳۸ پر محمد اجمل خاں کی کتاب "مختصر سیرتِ قرانیہ" پر تبصرہ ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ جلد دوم، صفحہ: ۲۱۲ پر علامہ اقبال کی "خطباتِ اقبال" پر تبصرہ ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس مجموعہ کے شروع میں مرتب کا مقدمہ، مولانا نایاب حسن قاسمی کا مضمون "مولانا سعید احمد اکبر آبادی: ایک مفکر، ایک دانش ور" اور حقانی القاسمی کا مضمون "مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا اُسلوبِ نگارش" خاصے کی چیزیں ہیں، اس مجموعہ میں ان مضامین کے علاوہ مولانا اکبر آبادیؒ کے تین مضمون بھی شامل ہیں، جن میں ایک مضمون "میری محسن کتابیں" ان کی مطالعاتی زندگی سے متعلق ہے جو "مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں" سے ماخوذ ہے، دوسرا مضمون "تصنیفی مشکلات" اور تیسرا مضمون "اردو رسم الخط" ماہنامہ برہان کے قدیم شماروں سے ماخوذ ہیں۔

یہ مجموعہ "مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے تبصرے" (دو جلد) علم و تحقیق سے وابستہ حضرات کے لیے ایک خزانے سے کم نہیں ہے۔

مراسلے

خطوط کی آخری کتاب

جاوید چوہدری

عطاء الحق قاسمی صاحب لیجنڈ ہیں' یہ پوری زندگی پڑھاتے رہے یہ پروفیسر ہیں' یہ پوری زندگی کالم لکھتے رہے یہ کالم نگار بھی ہیں' یہ پوری زندگی شعر بھی کہتے رہے یہ شاعر بھی ہیں گو ان کے شعر ''عدل کو بھی صاحب اولاد ہونا چاہیے'' کو ان سے زیادہ میاں شہباز شریف نے پڑھا اور مجھے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے اگر میاں صاحب سے یہ شعر واپس لے لیا جائے تو یہ شاید تقریر ہی نہ کر سکیں۔

قاسمی صاحب پوری زندگی ادب پڑھتے اور پڑھاتے بھی رہے یہ ادیب بھی ہیں' پاکستان میں جس دور میں لوگ لاہور سے قصور جاتے ہوئے بھی ڈرتے تھے یہ اس دور میں امریکا گئے کاروبار کیا' گرین کارڈ پھاڑ کر واپس آئے اور پھر ایک طلسماتی سفرنامہ لکھا' یہ سفرنامہ آج بھی سفرناموں کے آئین کا آرٹیکل ٦ ہے لہٰذا ہم میں سے کوئی بھی کچا پکا لکھاری ''شوق آوارگی'' سے بہتر سفرنامہ لکھنے کی جسارت نہیں کر سکتا اور یہ آخر میں دو ملکوں میں پاکستان کے سفیر بھی رہے اور اس شعبے میں بھی جھنڈے گاڑ آئے جب کہ یہ ۲۰۱۵ میں لاہور آرٹس کونسل کے چیئرمین بھی رہے اور نصف صدی سے معاصر کے نام سے پاکستان کا بہترین ادبی جریدہ بھی شائع کر رہے ہیں۔

یہ تمام پہلو شان دار ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں انسان اگر زندگی میں کچھ کرنا چاہے تو یہ ایک زندگی میں بھی بے شمار کام یاب زندگیاں گزار سکتا ہے' قدرت نے قاسمی صاحب کو ملٹی ٹاسکنگ کی نعمت سے نواز رکھا ہے' یہ اپنی ذات میں درجن بھر شخصیات لے کر پھر رہے ہیں اور ان شخصیات میں سے ہر شخصیت مکمل اور کام یاب بھی ہے لیکن ان کی زندگی کا ایک پہلو انتہائی حیران کن ہے اور وہ ہے

''حس مزاح'' یہ سر سے پاؤں تک مزاح میں گندھے ہوئے انسان ہیں' نفسیات یہ بتاتی ہے انسان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خشک' سنجیدہ اور مردم بےزار ہوتا جاتا ہے۔

شاید حقائق کی تلخی وقت گزرنے کے ساتھ انسان کی تازگی اور خوشی دونوں کو پی جاتی ہے لیکن قاسمی صاحب دنیا کے ننانوے اشاریہ ننانوے فیصد لوگوں سے بالکل مختلف ہیں' یہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ پرمزاح اور زیادہ ہلکے پھلکے ہوتے جارہے ہیں' ان کے ملاقاتی پہلے سے زیادہ ان کی کمپنی کو انجوائے کرتے ہیں' ان کی تحریروں میں بھی شوخی اور مزاح بڑھتا جارہا ہے۔

میرا دعویٰ ہے پاکستان میں قاسمی صاحب سے اچھی کوئی کمپنی نہیں' آپ ان کے ساتھ بیٹھ کر اپنے سارے غم بھول جاتے ہیں اور یہ ان سب کے ساتھ اس گزرتی ہوئی دم توڑتی ہوئی تہذیب کے سفیر بھی ہیں جسے میری نسل نے بھی صرف بچپن میں دیکھا تھا' ہم لوگ اس ملک کے آخری شہری ہیں جنہوں نے تانگوں میں سفر کیا' قینچی سائیکل چلائی' جن کی سائیکلوں کے کتے فیل ہوئے' جنہوں نے لالٹین اور مٹی کے تیل کے لیمپ دیکھے' زیرو کے بلب جلائے' جنہوں نے نلکوں کے نیچے بیٹھ کر کھلے آسمان کے نیچے غسل بھی فرمایا' نائیوں کے حمام میں نہانے کی لذت بھی لی۔

چکڑ چھولے بھی کھائے' ابے' تائے اور چاچے کی چھینٹی بھی کھائی' گرم دوپہروں میں چھتوں پر پتنگیں بھی اڑائیں اور ڈوریں بھی لوٹیں' آنا لائبریریوں سے کرائے پر ناول لے کر بھی پڑھے' لاؤڈ اسپیکروں پر اذانیں بھی دیں' دیسی شربت بھی بنائے' حکیموں کے مربے بھی کھائے' دودھ کی بالائی بھی چرائی' کریم رول بھی انجوائے کیے' چائے میں پاپے ڈبو کر بھی کھائے' ٹکٹ کے بغیر چھپ کر ٹرینوں میں سفر بھی کیا۔

ویگنوں میں ککڑ بھی بنے' بسوں کی چھتوں پر بھی لیٹے' تھوک سے سلیٹیں بھی صاف کیں' تختیوں کے اوپر بیٹھ کر تختیاں بھی سکھائیں' بنٹے بھی کھیلے اور ''کھتی'' میں پیشاب بھی کیا' اسکول میں مرغا بن کر ماسٹر کے چھتر بھی کھائے' ایکس چینج آپریٹر کو نمبر بتا کر فون بھی کیا' گھر میں چولہے کے گرد بیٹھ کر کھانا بھی کھایا' ماں کو چکی پیستے اور لسی بناتے بھی دیکھا' دادا اور دادی کو حکیم کی معجون سے شفاء یاب ہوتے بھی دیکھا' چھوٹے بہن بھائیوں کو مولوی صاحب سے دم بھی کرایا' کھوتی کی سواری بھی کی' کرتے سے

ناک بھی صاف کی اور ماں باپ کی مرضی سے شادی بھی کی، یہ تہذیب اب ختم ہو چکی ہے۔

ہم اس ملک کی آخری نسل ہیں جس نے ماں باپ کے حکم پر شادی کی تھی اور پہلی نسل ہوں گے جو بچوں کی شادی کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں گے، کیوں؟ کیوں کہ ہمارے بچوں کے بچے شادی کے بندھن ہی سے آزاد ہو چکے ہوں گے، یہ ''لیونگ ریلیشن شپ'' پر چلے جائیں گے اور عطاء الحق قاسمی صاحب اس تہذیب کے آخری سفیر ہیں، یہ ہم جیسے لوگوں کو ہمارا بچپن یاد کراتے رہتے ہیں اور ہم جم کر اس نائلیجیا کو انجوائے کرتے ہیں۔

قاسمی صاحب نے چند دن قبل مجھے اپنی تازہ ترین کتاب ''مشاہیر کے خطوط بنام عطاء الحق قاسمی'' بھجوائی، میں نے کتاب دیکھی تو یہ مجھے اولڈ فیشن محسوس ہوئی، کیوں؟ کیوں کہ دنیا میں خط کا کلچر ہی ختم ہو چکا ہے، خط اب صرف حکومت لکھتی ہے، لوگ اب صرف واٹس ایپ کرتے ہیں اور وہ بھی آڈیو، شادی کے کارڈز تک واٹس ایپ پر موصول ہوتے ہیں اور لوگ شمولیت سے معذرت بھی واٹس ایپ کے ذریعے ہی کرتے ہیں لیکن بیس سال پہلے تک خطوط رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتے تھے۔

ہم نے بچپن میں ہر محلے میں ''لیٹر باکس'' بھی دیکھا تھا اور وردی پوش ڈاکیا بھی، وہ سائیکل پر گھنٹی بجاتا ہوا آتا تھا اور محلے کے بچے اس کے پیچھے نعرے لگاتے ہوئے دوڑتے تھے لیکن یہ انسٹی ٹیوٹ بھی اب ختم ہو چکا ہے لہٰذا آج کے زمانے میں اگر کوئی شخص خطوں کی کتاب شائع کر دے تو یہ ٹائی شرٹ کے نیچے دھوتی محسوس ہوگی۔

مجھے یہ کتاب بھی شروع میں ایسی ہی محسوس ہوئی لیکن میں اسے جوں جوں پڑھتا گیا تو میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا، یہ کتاب صرف کتاب نہیں بلکہ یہ ادب، تہذیب، ثقافت اور سیاست کا البم ہے، یہ اردو زبان میں خطوں کی آخری کتاب بھی ہے، دنیا میں خط لکھنے، خط پہنچانے اور خط پڑھنے والے لوگ ہی ختم ہو چکے ہیں لہٰذا مستقبل قریب میں خط لکھے گا کون، خط پڑھے اور سنبھالے گا کون اور انھیں شائع کون کرے گا لہٰذا میرا خیال ہے یہ اردو میں خطوط کی آخری بڑی کتاب ثابت ہوگی۔

''مشاہیر کے خطوط بنام عطاء الحق قاسمی'' میں زندگی کے ہر طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والی ۲۴۵ ایسی شخصیات کے خطوط ہیں جو اپنے اپنے میدان کے شہ سوار تھے اور ہیں، قاسمی صاحب ایک وسیع

المشرب انسان ہیں، ان کے رابطے شاعروں، ادیبوں، حکمرانوں، سیاست دانوں، عالموں، سفیروں، وزیروں، بیوروکریٹس اور فوج کے اعلیٰ عہدے داروں سے تھے۔

عطاء الحق قاسمی تعلق نبھانے کا فن جانتے ہیں، یہ مقابل کے دل میں اتر جانے کے سلیقے اور قرینے سے بخوبی واقف ہیں، یہ سیاسی ونظریاتی اختلاف کو کشادہ دلی سے قبول بھی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا حلقہ احباب نہایت وسیع ہے لہٰذا لوگ انھیں خط لکھتے رہے اور یہ انھیں اپنے پاس محفوظ کرتے رہے اور یوں یہ کتاب وجود میں آگئی، مرزا غالب نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا تھا، ان خطوط کے مطالعہ کے دوران میں نے اس کتاب میں بھی مکالمے کا بھرپور چٹخارہ محسوس کیا۔ کاش میں ان خطوط کا مطالعہ بھی کر پاتا جو قاسمی صاحب نے جواباً تحریر کیے ہوں گے، وہ یقیناً ان سے بھی بہتر ہوں گے۔

یہ کتاب ڈاکٹر عائشہ عظیم نے مرتب کی، خاتون نے جس محنت، لگن، تندہی اور جان فشانی سے یہ کتاب مرتب کی وہ لائق تحسین ہے، آپ اگر لکھنے لکھانے کے عمل سے جڑے ہوئے ہیں اور آپ کو دوسروں کا لکھا ہوا پڑھنا بھی پڑتا ہے تو آپ جانتے ہوں گے ہر شخص خوش خط نہیں ہوتا، کبھی کبھی ''لکھے موسا، پڑھے خود آ'' والا معاملہ بھی پیش آجاتا ہے، ایسی صورت میں املا کی مختلف صورتوں سے واقف ہونا اور من وعن نقل کر دینا آسان نہیں ہوتا لہٰذا میں خاتون کی محنت کو داد دیتا ہوں۔

یہ مجموعہ مجھے ایک مکمل تھیسس محسوس ہوا جس پر ڈاکٹر عائشہ عظیم کو ایک اور پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا جا سکتا ہے، یہ مجموعہ یقیناً آنے والے زمانے میں ایک دستاویز اور ریفرنس بک کے طور پر دیکھا جائے گا، کتاب میں پاکستان کے تقریباً تمام نامور لوگوں کے خطوط موجود ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ بھارت کے سابق وزیر اعظم آئی کے گجرال، سکھ حریت پسندوں اور ایک ہائی جیکر کا خط بھی موجود ہے۔

مجھے یہ کتاب پڑھ کر محسوس ہوا آپ نے اگر کسی شخصیت کو پوری طرح سمجھنا ہو تو آپ اس کی تقریروں اور تحریروں کے ساتھ ساتھ اس کے خط بھی پڑھیں، آپ اس شخصیت کو مکمل طور پر سمجھ جائیں گے لہٰذا میں آخر میں عطاء الحق قاسمی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں انھوں نے مجھے میرے بچپن کی ایک اور لذت لوٹا دی، انھوں نے مجھے میرے خطوں کا زمانہ یاد کرا دیا، تھینک یو سر۔

ادب پارے

خواب، خوشبو اور کتاب

حقانی القاسمی

کتاب ایک بڑی کائنات ہے جس کے صفحے پر جو ننھے منے حروف جھلملاتے ہیں، وہ دراصل آپ کی اندھیری راہوں کو روشن کرتے ہیں۔ جب یہی حروف آہستہ آہستہ بڑے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے مل کر توپ اور تلوار سے بھی زیادہ طاقتور بن جاتے ہیں اور یہی ہماری اور آپ کی زندگی کو نئے خواب اور نئی منزلوں کا راستہ دکھاتے ہیں۔ ان حرفوں سے آپ کا رشتہ جڑتا ہے تو زندگی کی وہ بہت سی حقیقتیں روشن ہونے لگتی ہیں جن سے آپ پہلے واقف نہیں ہوتے۔ باہر کی ایک نئی دنیا ان حرفوں کے وسیلے سے آپ کے سامنے ہوتی ہے۔ ماضی کی تاریخ، تہذیب، اوراقِ پارینہ اور لفظوں کی ایک پوری خوبصورت دنیا سے آپ روبرو ہوتے ہیں۔ یہی حروف ہیں جو سورج، چاند ستارہ بن کر پوری زندگی آپ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور پوری دنیا سے مکالمے کا یہی ذریعے بنتے ہیں۔ ان حروف سے جو ایک کتاب بنتی ہے، وہ گلاب کی طرح آپ کے پورے وجود کو مہکاتی رہتی ہے۔ آپ کی سوچ میں جو روشنی، رنگ اور خوشبو ہے، وہ سب اسی کتاب کی وجہ سے ہے۔ یہی چھوٹی چھوٹی کتابیں آپ کی زندگی کو بہت بڑا بنا دیتی ہیں، اس لیے بچو! کتابوں سے اپنا رشتہ جوڑیے کہ اسی میں روشنی ہے اور راحت بھی۔ یہی آپ کی منزل ہے اور مستقبل بھی۔ زندگی سے یہ حروف غائب ہو جائیں تو روشنی دور بہت دور چلی جاتی ہے، آنکھوں میں اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔ کتابوں کے ان حرفوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ خاک کو خورشید بنا سکتی ہے، یہی حروف ہمارے خواب کو تعبیر عطا کرتے ہیں، ہمارے پَر کو پرواز دیتے ہیں، ہماری آرزوؤں اور امنگوں کو نئی اڑان دیتے ہیں۔ کتابوں کے ان حرفوں میں رات کی رانی اور چنبیلی کی عجب مدہوش کن خوشبو ہوتی ہے۔ ذرا سا چھونے سے پورے وجود میں یہ خوشبو پھیل جاتی ہے۔ لفظ و خیال اور احساس و اظہار کی خوشبو سے رشتہ جڑتے ہی ذہن میں توانائی اور تابندگی سی محسوس ہوتی ہے اور انہی حرفوں سے بنی کتاب سے شعور و آگہی کے دریچے کھلتے ہیں جن میں ہماری ترقی اور کامیابی کے سارے راز ہیں۔ کتابوں کے

بغیر کوئی بھی معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ کسی قوم کی تاریخ محفوظ رہ سکتی ہے۔ ہر کامیابی اور کامرانی کے پیچھے انہی حرفوں کا جادوئی طلسم ہوتا ہے۔ آج جب ماحول میں ہر طرف منافرت، کثافت، آلودگی اور بارود کی بُو پھیلی ہوئی ہے تو ایسے میں کتاب کی خوشبو ہی ہمیں ہر منفی سوچ اور احساس سے محفوظ رکھتی ہے اور مثبت راہ دکھاتی ہے۔ غلام محمد قاصر کا بہت اچھا شعر ہے:

بارود کے بدلے ہاتھوں میں آجائے کتاب تو اچھا ہو

اے کاش ہماری آنکھوں کا اکیسواں خواب تو اچھا ہو

مکتبۃ تراث الأدبِ کی فہرست کتب

نام کتاب	مصنّف	قیمت
اساتذہ کا معلّم	مولانا ابن الحسن عباسیؒ	200/-
التجائے مسافر (علمی، ادبی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ)	مولانا ابن الحسن عباسیؒ	300/-
النخیل (سالانہ ممبر شپ)	مولانا ابن الحسن عباسیؒ	600/-
تجربات و مشاہدات	مولانا بدر الحسن قاسمی مدظلہ	زیر طبع
داستان کہتے کہتے (علمی، ادبی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ)	مولانا ابن الحسن عباسیؒ	300/-
دینی مدارس	مولانا ابن الحسن عباسیؒ	250/-
قلم نما (علمی، ادبی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ)	مولانا ابن الحسن عباسیؒ	270/-
کتابوں کی درسگاہ میں (ہزاروں صفحات کے مطالعہ سے منتخب نکات و لطائف)	مولانا ابن الحسن عباسیؒ	270/-
کتب نما (پانچ سو سے زیادہ کتابوں کا تعارف و تبصرہ)	مولانا ابن الحسن عباسیؒ	450/-
کرنیں (علمی، ادبی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ)	مولانا ابن الحسن عباسیؒ	320/-
متاع وقت اور کاروان علم	مولانا ابن الحسن عباسیؒ	320/-
نقوشِ پا کی تلاش میں (علمی، ادبی و تحقیقی سفرناموں کا مجموعہ)	مولانا عبد المتین منیری مدظلہ	220/-
وفاق المدارس العربیہ پاکستان۔ساٹھ سالہ تاریخ	مولانا ابن الحسن عباسیؒ	1200/-
یادگارِ زمانہ شخصیات کا احوال مطالعہ	مولانا ابن الحسن عباسیؒ	800/-
یہ تھے اکابر مظاہر	مفتی ناصر الدین مظاہری مدظلہ	400/-

دیگر اداروں کی مطبوعات بھی دستیاب ہیں۔